اسلامی وجمہوری نظام کی روشنی میں ریاست کے اداروں میں سربراہان کے تقرر کے اصول وضوابط

(تجزیاتی مطالعہ)

تحقیقی مقالہ برائے ایم فل (علوم اسلامیہ)

مقالہ نگار

محمد ضیاء الرحمان

ایم فل، علومِ اسلامیہ

نگران مقالہ

ڈاکٹر سید عبد الغفار بخاری

صدر شعبہ علوم اسلامیہ

شعبہ علومِ اسلامیہ

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

مئی ۲۰۱۹ء

اسلامی وجمہوری نظام کی روشنی میں ریاست کے اداروں میں سربراہان کے تقرر کے اصول وضوابط

(تجزیاتی مطالعہ)

تحقیقی مقالہ برائے ایم فل (علوم اسلامیہ)

مقالہ نگار

محمد ضیاء الرحمان

ایم فل، علومِ اسلامیہ

نگران مقالہ

ڈاکٹر سید عبد الغفار بخاری

صدر شعبہ علوم اسلامیہ

شعبہ علومِ اسلامیہ

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

مئی ۲۰۱۹ء

©

محمد ضیاء الرحمان

منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ

(Thesis and Defense Approval form)

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالہ کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف سوشل سائنسز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالہ بعنوان: **اسلامی وجمہوری نظام کی روشنی میں ریاست کے اداروں میں سربراہان کے تقرر کے اصول وضوابط (تجزیاتی مطالعہ)**

نام ڈگری: ایم فل علوم اسلامیہ

نام مقالہ نگار: محمد ضیاء الرحمان

رجسٹریشن نمبر: 1090-MPhil/IS/F15

ڈاکٹر سید عبد الغفار بخاری _____

(نگران مقالہ) نگران مقالہ کے دستخط

پروفیسر ڈاکٹر شاہد صدیقی _____

(ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز) ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز کے دستخط

بریگیڈیئر محمد ابراہیم _____

(ڈائریکٹر جنرل) ڈائریکٹر جنرل کے دستخط

تاریخ: _____

حلف نامہ فارم

(Candidate declaration form)

میں محمد ضیاء الرحمان ولد قاری محمد سعید الرحمان

رجسٹریشن نمبر: 1090-MPhil/IS/F15

طالب، ایم فل علوم اسلامیہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (نمل) اسلام آباد حلفاً اقرار کرتا ہوں کہ مقالہ

بعنوان: **اسلامی وجمہوری نظام کی روشنی میں ریاست کے اداروں میں سربراہان کے تقرر کے اصول وضوابط (تجزیاتی مطالعہ)**

ایم فل علوم اسلامیہ کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے سلسلہ میں پیش کیا گیا ہے، اور ڈاکٹر سید عبد الغفار بخاری کی نگرانی میں تحریر کیا گیا ہے، راقم الحروف کا اصل کام ہے، اور یہ کہ مذکورہ کام نہ تو کہیں اور جمع کروایا گیا ہے، نہ ہی پہلے سے شائع شدہ ہے اور نہ ہی مستقبل میں کسی بھی ڈگری کے حصول کے لیے کسی دوسری یونیورسٹی یا ادارے میں میری طرف سے پیش کیا جائے گا۔

نام مقالہ نگار: محمد ضیاء الرحمان

دستخط مقالہ نگار: _____

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

فہرست موضوعات

نمبر شمار	موضوعات	صفحہ نمبر
۱.	منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ	IV
۲.	حلف نامہ فارم	V
۳.	فہرست موضوعات	VI
۴.	انتساب	VIII
۵.	اظہار تشکر و امتنان	IX
۶.	مقدمہ	X
۷.	**باب اول: اسلامی ریاست کا تعارف ، آغاز و ارتقاء، نظریاتی بنیادیں اور خصوصیات**	۱
۸.	فصل اول: اسلامی ریاست کا تعارف	۲
۹.	فصل دوم: اسلامی ریاست کا آغاز و ارتقاء	۱۶
۱۰.	فصل سوم: اسلامی ریاست کی نظریاتی بنیادیں	۲۷
۱۱.	فصل چہارم: اسلامی ریاست کی خصوصیات	۳۲
۱۲.	**باب دوم: جمہوری ریاست کا تعارف ، آغاز و ارتقاء ، تشکیلی پہلو اور بنیادی نظریات**	۴۴
۱۳.	فصل اول: جمہوری ریاست کا تعارف	۴۵
۱۴.	فصل دوم: جمہوری ریاست کا آغاز و ارتقاء	۵۴
۱۵.	فصل سوم: جمہوری ریاست کے تشکیلی پہلو	۶۱
۱۶.	فصل چہارم: جمہوری ریاست کے بنیادی نظریات	۶۸
۱۷.	**باب سوم: اسلامی ریاست اور جمہوری ریاست کے اداروں کا جائزہ**	۷۶
۱۸.	فصل اول: اسلامی ریاست کے اداروں کا تعارف	۷۷
۱۹.	فصل دوم: جمہوری ریاست کے اداروں کا تعارف	۸۹
۲۰.	فصل سوم: اسلامی ریاستی اداروں کی امتیازی خصوصیات	۹۷
۲۱.	فصل چہارم: جمہوری ریاستی اداروں کی خصوصیات	۱۰۶
۲۲.	**باب چہارم: اسلامی وجمہوری ریاستی اداروں میں سربراہان کے تقرر کے اصول وضوابط کاجائزہ**	۱۱۲

۲۳.	فصل اول: اسلامی ریاست میں اداروں کے سربراہان کے تقرر کے اصول	۱۱۳
۲۴.	فصل دوم: جمہوری ریاست میں اداروں کے سربراہان کے تقرر کے اصول	۱۲۹
۲۵.	فصل سوم: اداروں پر سربراہان کے اثرات اہلیت اور نا اہلیت کے تناظر میں	۱۴۷
۲۶.	فصل چہارم: اسلامی وجمہوری ریاست کے مابین تصادم اور اس کا حل	۱۵۷
۲۷.	نتائج مقالہ	۱۷۳
۲۸.	حاصل کلام	۱۷۵
۲۹.	سفارشات	۱۷۶
۳۰.	فہرست قرآنی آیات	۱۷۸
۳۱.	فہرست احادیث مبارکہ	۱۸۰
۳۲.	فہرست اعلام	۱۸۱
۳۳.	مصادر ومراجع	۱۸۲

انتساب

اپنے والد قاری محمد سعید الرحمن رحمۃ اللہ علیہ سے اور خاص کر اپنی والدہ رحمۃ اللہ علیہا سے جنہوں نے ہماری یتیمی کا احساس بھی نہیں ہونے دیا اور ہماری پرورش کی اور تعلیم سے وابستہ رکھا۔ اللہ رب العزت دونوں کو جنت الفردوس عطاء فرمائے۔ آمین۔

اظہارِ تشکر

الحمدلولیه والصلوة علیٰ نبیه وعلیٰ اله واصحبه المتادبین بادابه اما بعد!

تمام قسم کی تعریفات، تمجیدات اور تہلیلات اس اللہ رب العزت کے لیے ہیں جس نے حضرت انسان کو اشرف المخلوقات پیدا کر کے "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" کا تاج پہنایا اور انسانیت کی رشد و ہدایت کے لیے مکرم و معظم محتشم و منور، معطر و بابرکت اور باسعادت ہستی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب اطہر پر قرآن مجید اور اس کی مثل نازل کر کے اس دنیائے جہان کے لوگوں کو رہن سہن کے آداب کے ساتھ ساتھ اسلامی، معاشی اور زری اصول بھی سکھائے۔ اور بندہ ناچیز کو اس عظیم کام " **اسلامی وجمہوری نظام کی روشنی میں ریاست کے اداروں میں سربراہان کے تقرر کے اصول وضوابط(تجزیاتی مطالعہ)** "مرتب کرنے کے لیے منتخب فرمایا میں پیغمبر کائنات حضرت محمد ﷺ کے فرمان "من لم یشکرالناس لم یشکر الله" کا مصداق بننے کے لیے تمام احباب اور دوستوں کے لیے دعا گو ہوں جن کی محبت خصوصی دعائیں اور قیمتی مشورے اور عملی تعاون شامل حال رہا اللہ تعالی ان سب کو دنیا اور آخرت میں اس کا بہترین بدلہ اور خیر کثیر عطا فرمائے آمین۔

اللہ تعالی کا یہ بھی احسان عظیم رہا کہ اس مقالے کے ابتدائی مرحلے سے لے کر آخری مرحلے تک ڈاکٹر سید عبدالغفار بخاری صاحب صدر شعبہ علوم اسلامیہ نمل یونیورسٹی اسلام آباد کی خصوصی محبت و شفقت اور توجہ مجھے حاصل رہی انھوں نے انتہائی دیانت داری کے ساتھ ضروری علمی اور فنی مہارت سے میری راہنمائی فرمائی۔ لہذا میں ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں اور ان کے لیے دعا گو ہوں اللہ رب العزت دنیا و آخرت میں انھیں اجر جزیل عطا فرمائے آمین۔ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز کے شرف اور فضل کا اعتراف نہ کرنا علمی ناقدری کی علامت ہو گی جس مادر علمی کی وجہ سے مجھے ایم فل کا تحقیقی کام کرنے کا موقع ملا اس سلسلے میں شعبہ علوم اسلامیہ کے اساتذہ کرام خصوصیت کے ساتھ جذبات تشکر کے مستحق ہیں جن میں سر فہرست ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز محترم ڈاکٹر شاہد صدیقی صاحب کا میں دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں، نیز اپنے تمام دوستوں اور ساتھی اساتذہ کا احسان مند ہوں اور خاص طور پر اپنی اہلیہ اور بچوں کا جن کی دعاؤں اور مفید مشوروں نے دوران مقالہ مجھے حوصلہ دیا۔

مقالے کی کمپوزنگ کے سلسلے میں جناب قاری محمد ابرار صدیقی صاحب کا تعاون بھی قابل ذکر ہے کہ جنہوں نے ہر مرحلے پر میرا ساتھ دیا اور وقت نکالا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیاو آخرت میں ان سب کو بہترین اجر عطا فرمائے اور مجھے اور تمام اہل اسلام کو دین کی اشاعت کا ذریعہ بنائے۔ آمین!

مقدمہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

موضوع کا تعارف:

اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے اسلام جہاں انفرادی زندگی میں فرد کی ہر شعبہ میں راہنمائی کرتا ہے وہیں افراد کی اجتماعی زندگی میں بھی ہر شعبہ میں مکمل طور پر راہنمائی کرتا ہے اجتماعی زندگی کا اہم شعبہ اسلام کا سیاسی نظام ہے اور یہ سیاسی نظام اور اس کے اقدامات پر مشتمل نظام ہے اسلام جہاں فرد کی زندگی کی بات کرتا ہے وہیں اسلام افراد کی زندگی کی بات بھی کرتا ہے۔ جب اسلام فرد کی زندگی کی بات کرتا ہے تو وہاں فرد کی زندگی کی ترجیحات کو مدّ نظر رکھتا ہے فرد کی زندگی میں عبادات، عقیدہ، نظریہ کی بات کرتا ہے اسے اہمیت دیتا ہے اور جب افراد کی یا معاشرے کی بات کرتا ہے تو اس کی ترجیحات الگ ہیں اجتماعی زندگی میں اسلام کے سیاسی نظام کی ترجیحات "امن" اور "معیشت" ہیں پھر دنیا کا امن پیشِ نظر ہوتا ہے۔ کیسے امن آسکتا ہے اور پوری دنیا کے امن کے لیے کیا اقدامات کرنے چاہئیں ؟۔ اور معیشت یا معاشی ترقی پیش نظر ہوتی ہے۔ اسلام کے اسی اجتماعی نظام کے لیے اسلام نے اسلامی حکومت کا نظام پیش کیا ہے۔ اسلام نے حکومت کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی بنیاد مندرجہ ذیل اصولوں پر ہے:

۱۔ اللہ کی حاکمیت

۲۔ شورائیت کا نظام

۳۔ سربراہِ حکومت کا تقرر

۴۔ حاکم / خلیفہ

۵۔ اقامتِ صلٰوۃ

۶۔ زکٰوۃ کا نظام

۷۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر

۸۔ عدل وانصاف کا قیام

ان بنیادی اصولوں کے ضمن میں کئی دیگر اصول بھی ملتے ہیں جو کہ ان اصولوں کی وضاحت میں واضح ہو جائیں گے

۱۔ اللہ تعالٰی کی حاکمیت

اس کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ اس کائنات پر اصل حاکمیت اللہ تبارک وتعالیٰ کو حاصل ہے یہ اسلامی ریاست کی وہ بنیادی اکائی ہے جسے قرآن مجید نے واضح طور بیان کیا ہے۔ قرآن پاک کی آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے قانون پر فیصلہ کرنا جاہلیت ہے اور ایمان ویقین کا تقاضہ ہے کہ اللہ کے نازل کردہ شرعی قانون کو بہترین مان کر اس کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیئے۔

اگر حاکمیت کا دارومدار انسانی عقل پر ہوتا تو پھر نہ انبیاء علیہم السلام کو بھیجنے کی ضرورت تھی نہ آسمانی کتابیں نازل کرنے کی حاجت تھی اللہ رب العزت نے کتابیں اس لیے نازل کیں کہ لوگوں کے معاملات، مسائل اور اختلافات کا فیصلہ ان کتابوں کے مطابق کیا جائے اور انسانوں کی زندگیوں کے لیے واجب الاطاعت قانون بنایا جائے۔

زیر نظر مقالہ اسلامی ریاست کے خدوخال اور اسلامی ریاست میں قائم ادارے اور ان اداروں کے سربراہان کے لیے قرآن وحدیث کے بیان کردہ اصول وضوابط، عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں جن حضرات کو ان اداروں کے مناصب پر فائز کیا گیا ان افراد کی قابلیت واہلیت ، اور جمہوری ریاست کے خدوخال اور جمہوری ریاست کے ادارے اور ان اداروں کے سربراہان کے تعین کے لیے وضع کردہ اصول وضوابط اور پاکستان میں عہدوں پر فائز افراد کی قابلیت واہلیت کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

بیان مسئلہ:

اسلام ایک مکمل ضابطہء حیات ہے، اسلام صرف عبادات کا دین نہیں بلکہ اسلام میں عبادات ہیں اس سے انکار نہیں لیکن عبادات اسلام نے انفرادی زندگی میں فرد کی ترجیح قرار دی ہے جہاں اجتماعی زندگی کی بات ہوتی ہے وہاں تو اسلام مکمل نظام پیش کرتا ہے اور معاشرے کو صرف مذہب کی نگاہ سے نہیں دیکھتا بلکہ معاشرے کو انسانیت کا نام دیتا ہے اور معاشرے کے ہر فرد کی اصلاح، ہر فرد کی جان، مال، حقوق کے تحفظ کی بات کرتا ہے قطع نظر اس کے مذہب، رنگ اور نسل کے بحیثیتِ انسان معاشرے کی تشکیل کرتا ہے۔ انسانوں کی فلاح وبہبود کے لیے فلاحی ریاست کے قیام کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ صرف عبادات کا دین ہے یہ غلط ہے۔ عبادات صرف انفرادی زندگی کی ترجیحات ہیں جبکہ اسلام اجتماعی زندگی میں معاشرے کے امن اور معیشت کو ترجیح دیتا ہے یہی بات واضح کرنا مقصود ہے کہ اسلام کو آج صرف عبادات کا دین بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور اسے صرف فرد کی زندگی تک محدود کر دیا گیا ہے گویا کہ اجتماعی زندگی میں اسلام معاشرے کی راہنمائی نہیں کر سکتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام حکومت کی راہنمائی بھی نہیں کر سکتا، جب کہ یہ

بات قطعاً غلط ہے زیر نظر مقالے میں اسلام کے سیاسی نظام کو بیان کیا ہے، اور اسلامی نظام پر مبنی ریاست کے اداروں اور ان اداروں کے سربراہان کا تعارف، اوصاف بیان کر کے اسلام کے سیاسی نظام کو واضح کیا ہے۔

ملکِ پاکستان کی ترقی اور استحکام اسلامی ریاست کے لیے وضع کردہ اصول وضوابط کو اپنائے بغیر ممکن نہیں پوری دنیا عموماً اور عالمِ اسلام خصوصاً عالمی مہم کے نتیجے میں جن حالات سے دوچار ہے ان سے نکلنے کے لیے اسلام کا نظام حکمرانی اور اسلامی ریاست کے نظریات کو کتاب وسنت سے دلائل کی روشنی میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق:

۱. اسلام میں فلاحی ریاست کا تصور (دور نبوی اور خلافتِ راشدہ کے تناظر میں)، مقالہ نگار محمد بشیر احمد نمل
۲. اسی طرح عصرِ حاضر میں اسلامی ریاست کی تشکیل مسلم مفکرین کے افکار کی روشنی میں، مقالہ نگار فرید الدین طارق نمل
۳. اسلامی ریاست کے رہنما اور بنیادی اصول صحیح بخاری کی روشنی میں، تہمینہ جمشید خان (۱۱۴۹۹۶) ۲۰۰۷ نمل
۴. The principles of state and government in Islam ,Asad Muhammad ۱۱۶۸۳۱ اوپن یونیورسٹی
۵. سرکاری ملازمین کی تقرری، تربیت اور کردار السیاسۃ الشرعیۃ کی روشنی میں ،طاہرہ جبیں (۱۱۶۸۲۴) ۲۰۰۷
۶. دورِ خلافتِ راشدہ اور پاکستان میں قضاۃ کی اہلیت اور تقرری کے طریقہ کا تقابلی جائزہ، مقالہ نگار افضل محمد ۱۱۶۸۳۲ (۲۰۰۹) اوپن یونیورسٹی
۷. خلافت وجمہوریت تقابلی مطالعہ، مقالہ نگار مستغیض احمد علوی نگران ڈاکٹر حمید اللہ عبد القادر (۲۰۰۳) ۱۰۱ پنجاب یونیورسٹی
۸. اسلامی ریاست کی تشکیل جدید محمد اسد کے افکار کا تنقیدی جائزہ، مقالہ نگار ظہور اللہ نگران ڈاکٹر ثمر فاطمہ (۲۰۰۸) ۱۳۳ پنجاب یونیورسٹی
۹. تصورِ قیادت اسلامی اور عصری افکار کا تقابلی جائزہ، مقالہ نگار مسز زریں ریاض نگران ڈاکٹر شبیر احمد منصوری (۲۰۰۹) ۱۴۶ پنجاب یونیورسٹی

تحقیق کی اہمیت:

دینِ اسلام کی بنیاد وحیِ ربانی پر قائم ہے اور قرآن کے اصول غیر متبدل اور نا قابل تغیر ہیں۔ قرآنی تعلیمات پر قائم ہونے والا معاشرہ نہ تو غیر مہذب ہو سکتا ہے اور نہ پسماندہ لیکن موجودہ مسلم معاشرے قرآنی تعلیمات سے بے خبر ہیں۔ یورپی و امریکی مفکرین جس تھیوری کو درست ثابت کرنے کے لیے اپنے پاس سے دلائل اور پروف کے انبار لگادیں، ہمارے مفکرین بھی ذہنی مرعوبیت کی وجہ سے اسے قرآن کی کسوٹی پر جانچے بغیر (Authentic) تسلیم کر لیتے ہیں۔

گزشتہ دو تین صدیوں سے اسلام کے خلاف عالمی یلغار نے اسلام اور مسلمانوں کو اس قدر پیچھے دھکیل دیا کہ عام مسلمانوں اور بعض اوقات اسلام کے فروغ کے لیے کام کرنے والے علماء بھی اس کے اثرات سے خود کو نہیں بچا پائے جس کا سب سے نمایاں اثر مسلمانوں پر یہ ہوا کہ مسلمانوں نے اسلام کو صرف عبادات کا دین سمجھ لیا یعنی انفرادی زندگی میں تو انسان کی راہنمائی کرتا ہے لیکن اجتماعی زندگی میں نہیں مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات ڈال دی گئی کہ اسلام کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں کیوں کہ ادارے اور اداروں کے عہدیداروں کے اصول بدل دیئے گئے اسلام کے اصول و مقاصد پر سے مسلمانوں کا یقین ختم کر دیا گیا مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ نہایت خطرناک Trend ہے کہ انسان اصول و مقاصد پر یقین کھو دے۔ یہ کیفیت انسان کے فطری مزاج اور طبیعت کے بھی خلاف ہے کیونکہ بحثیت انسان بالخصوص مسلمان کے اسلامی فلسفہ حیات اور مقصد حیات کے بغیر زندگی گزارنا ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں دعا ہے کہ تحقیقی مقالہ قارئین کے لیے علمی و عملی تعلیم و تربیت اور صحیح قرآن و سنت کے فلسفۂ حکومت کی درس و تدریس میں معاون ثابت ہو۔ آمین۔

تحدید:

تحقیق کا دائرہ کار پاکستان کی اسلامی اور جمہوری ریاست تک محدود ہے۔

مقاصدِ تحقیق:

موضوع زیر بحث پر علمی تحقیق سے مقاصدِ ذیل کا حصول مقالہ نگار کے پیش نظر ہیں:

۱۔ اسلامی و جمہوری ریاست کے افکار و نظریات اور اصول و مقاصد کی وضاحت کرنا۔

۲۔ اسلامی و جمہوری ریاست کے نتائج و اثرات سے آگاہی حاصل کرنا۔

۳۔ اسلامی و جمہوری ریاست کے اداروں کا تعارف اور ان میں سربراہان کے تقرر کے اصول و قواعد واضح کرنا۔

۴۔ مروجہ نظام جو چیلنج پیش کرتے ہیں ان کا اسلام کی روشنی میں جواب پیش کرنا۔

تحقیقی سوالات:

۱۔ اسلامی ریاست اور جمہوری ریاست کیا ہے؟

۲۔ اسلامی اور جمہوری ریاست کے ادارے کون کون سے ہیں؟

۳۔ اسلامی ریاست کے اداروں میں سربراہ کے تقرر کے اصول وضوابط کیا ہیں؟

۴۔ جمہوری ریاست کے اداروں میں سربراہ کے تقرر کے قواعد کون سے ہیں ؟

پس منظری مطالعہ:

دنیا کے تمام مذاہب میں اصولی مصادر کے علاوہ کچھ ایسی کتابیں بھی موجود ہوتی ہیں جو اصولی مصادر کی روشنی میں کسی ایسے ادب کو تخلیق کرتی ہیں جس کا تعلق سماج کی نگرانی، سماج میں مذہبی اقدار کے نفاذ اور متعدد قسم کے ایجابی وسلبی احکام سے متعلق ہوتا ہے مثلاً ہندو مت کی مقدس کتاب "ویدا" جو پندرہ سو قبل مسیح کی درمیانی مدت میں لکھی گئی۔ وہ ان سماجی، ریاستی اور سلطانی احکام اور ضوابط اخلاق کا پیش خیمہ بنی جو ۱۰۰ سال میں منو دہرم شاستر کی شکل میں تخلیق کی گئی۔

منو دہرم شاستر کے مقدمہ میں بھی اس بات کو مانا گیا ہے کہ وید ، سمرتی، سدھا چار یعنی نیک لوگوں کی طرزِ زندگی یا رواج اور آتمستی (یعنی مطمئن ضمیر) قانون سے متعلق ادب کے سرچشمے ہیں۔ تاہم وید دھرم یعنی قانون کا اساسی سرچشمہ ہے۔

اسی طرح بائبل کے ابتدائی پانچ ابواب پر مشتمل تورات اور اس کی ذیلی دو اہم کتب یعنی نبیم(Nevi im) اور کتبیم(Ketuvim)سلطانی احکام سے متعلق مشنا اور جمارا کے لیے مواد فراہم کرتی ہے جو ۴۰۰ اور ۵۰۰ صدی عیسوی کے درمیانی مدت میں تالمود کی شکل میں سامنے آئی ہے۔

حکمرانی اور طرزِ حکمرانی کے حوالے سے قرآن کریم کے نصوص شفاف اور قطعی الدلالت ہیں جو کسی ایسی قوت کے وجود کا تقاضا کرتے ہیں جو سماج سے شر کو مٹائے اور خیر کو فروغ دے یا کوئی ایسی خلافت جو عدل کو قائم کرے، امن کو یقینی بنائے اور دہشت اور خوف کا ازالہ کرے۔

قرآن کریم کے نصوص کے علاوہ احادیث نبویہ بھی ریاستی طریقہ کار، حق انتخاب اور حکومتی ادارہ سازی کے لیے مواد فراہم کرتی ہیں ۔ چنانچہ کتبِ احادیث میں ابواب السیر، ابواب الامارۃ، ابواب الاحکام اور اس کے مترادف

ابواب میں ایسی احادیث ہیں جن کا تعلق حکمرانی کے اصول سے ہے۔ گو کہ دوسری صدی ہجری سے پہلے سلطانی ادب کی نپی تلی اصطلاح موجود تو نہیں تھی تاہم وہ مفہوم بدرجہ اتم موجود تھا جس پر یہ اصطلاح دلالت کرتی ہے۔

سلطانی ادب کی تعریف یوں کی گئی ہے: "سلطانی یا سیاستِ شرعیہ کے احکام کا اطلاق ان امور پر ہوتا ہے جو نظم حکومت، اسکے اصول، حاکم کی بالادستی اور ہر فریق کے حقوق و فرائض سے متعلق ہوں۔ قانونی اصطلاح میں اس قسم کے احکام احکامِ دستوریہ کہلاتے ہیں ۔

مندرجہ بالا تعریف اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اسلام کے سلطانی ادب یا اس کے مترادف کسی بھی ایسی اصطلاح جو اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہو، تب شرعی دائرے میں داخل متصور ہوگی جب وہ کسی بھی پہلو سے شرعی نصوص کے ساتھ متصادم نہ ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سلطانی ادب سے متعلق متقدمین اور متاخرین فقہاء نے بہت ہی قابل قدر مواد چھوڑا ہے لیکن ان میں کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے بلاشبہ اس شعبہ کے متعلق خصوصی کام کیا ہے اور وہ اپنے زمانہ کے حکمرانوں کے حالات اور سیاسیات سے بخوبی واقف تھے۔ اس لیے یہاں پر چند ان شخصیات اور ان کی تصانیف کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ جو اس شعبہ (سلطانی ادب) سے متعلق ہیں۔

اس ضمن میں سرفہرست یعقوب بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۸۲ھ) المعروف بہ قاضی ابو یوسف کا نام آتا ہے جنہوں نے کتاب الخراج لکھ کر سلطانی ادب کی داغ بیل ڈالی۔ کتاب الخراج دراصل ایک مراسلہ (Epistle) ہے جو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے عباسی خلیفہ ہارون الرشید (م ۱۹۳ھ) کو لکھا ہے یہ مراسلہ اس لحاظ سے اہم اور قابلِ قدر ہے کہ اس میں پہلی بار انتہائی شرح وبسط کے ساتھ اسلام کے اصولِ حکمرانی، تنظیم بیت المال، محاصل کی وصولی اور تقسیم، ضرائب (ٹیکسز) کی نوعیت و تحدید اور اس قسم کے دیگر امور سے بحث کی گئی ہے۔ یہ وہ پہلی کتاب ہے جو اسلامی ریاست کے اندر غیر مسلموں کے حقوق اور ان پر ناجائز ضرائب (ٹیکسز) کے متعلق تفصیل سے بتاتی ہے۔

اسلامی دنیا میں ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ (م ۸۰۸ھ) کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ نویں صدی میں ان کی مرتب کردہ کتاب "**العبردیوان المبتد والخبر فی تاریخ العرب والعجم والبربر**" اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس کے مقدمہ میں ریاستی امور سے متعلق شرح وبسط سے بحث کی گئی ہے۔

حکمران کے اوصاف سے بھی آپ رحمۃ اللہ علیہ نے بحث کی ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک چار صفات کا ہونا حکمران میں ضروری ہے:

۱۔ علم

۲۔ عدالت

۳۔ کفایت

۴۔ اعضاو حواس کی سلامتی

آپ رحمۃ اللہ علیہ علم کا معیار اجتہاد واستنباط قرار دیتے ہیں اوراس سے کم پر راضی نہیں ہوتے۔ جب کہ عدالت سے مراد حکمران کی عملی اور نظری زندگی کا اسلامی اصولوں کے مطابق ہونا ہے۔ اور کفایت سے مراد ایسی مادی اوررروحانی صفت ہے جو عوام الناس کو اس کی عزت کرنے پر آمادہ کرے۔ اس لیے سربراہ کا دلیر ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔ حکمران کے فرائض میں تین چیزوں کو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے زیادہ اہمیت دی ہے:

۱۔ حمایت

۲۔ اقامتِ حدود

۳۔ تدبیرِ مصالح

اسی طرح آپ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سربراہ مملکت کا حواس اور اعضاء کے لحاظ سے سلامت ہونا بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ ان نقائص کی وجہ سے وہ فرائضِ منصبی سے صحیح طریقہ پر عہدہ برآں نہیں ہو سکتا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے بھی بحث کی ہے کہ خلیفہ کا قریش میں سے ہونا بھی ضروری نہیں ہے ۔ اور اس کو شرطِ کفایت قرار دیا ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ بیک وقت دویازیادہ خلفا ءکے وجود کو جائز قرار دیتے ہیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر سلطنت وسیع ہو اور حکومت کمزور ہو تو قیامِ امن ناممکن ہو گا اس لیے ہر علاقہ اپنی مدافعت کرنے اور نظام قائم رکھنے کا ذمہ دار ہوتا ہے اس کے لیے وہ خلفائے عباسیہ کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ اس سے بھی بحث کرتے ہیں کہ حکومت کو بیرونی خطرات سے نمٹنے کے لیے فوج رکھنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور فوج کے ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے حکومت کو عوام پر ٹیکس عائد کرنے پڑتے ہیں۔

امام تقی الدین ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (م۷۲۸ھ) کو جہاں فقہی علوم میں ید طولیٰ حاصل تھا وہیں اپنے پیش رو ائمہ کی طرح سلطانی اور ریاستی امور سے متعلق تحقیقی مواد کی تیاری اور نصوص شرعیہ کے ساتھ ان کے عمل انطباق پر بھی عبور رکھتے تھے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور زمانہ فتاویٰ کی متعدد اجزاء ریاستی امور سے متعلق ہیں تاہم اس ضمن میں ان کی کتاب "السیاسۃ الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیہ" کو اس لحاظ سے اہمیت حاصل ہے کہ اس میں ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک

موضوع کے طور پر سیر حاصل بحث کی ہے جس میں اصولِ ریاست ،امارت، سلطنت خوبصورت انداز میں بیان کئے ہیں۔یہ کتاب ساتھ فصلوں پر مشتمل ہے۔

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی وجہ تالیف یہ لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم مسلمانوں پر حکمرانوں کو نصیحت کرنا لازم اور واجب کیا ہے۔اس کو مد نظر رکھ کر رسالہ کو لکھا گیا ہے جس کی بنیاد اس آیت پر رکھی گئی ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا﴾[1]

ترجمہ:اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو۔

قرآنی نصوص(جیسا کہ پہلے کہا گیا)ایک مستحکم ریاست کے قیام کا تقاضا کرتے ہیں۔انہی کی بنیاد پر مدینہ منورہ کی پہلی اسلامی ریاست کی داغ بیل ڈالی گئی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دس سالہ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے تیس سالہ دور میں اسی اساس پر قائم رہی۔گو کہ اس زمانے میں سلطانی اور خلافتی امور سے متعلق باضابطہ ادب کا وجود تو نہیں تھا تاہم اس عہد میں وہ مفہوم بدرجہ اتم موجود رہا جس پر دوسری صدی ہجری اور زمانہ مابعد میں تشکیل شدہ سلطانی ادب دلالت کرتا ہے۔آنے والی صدیوں میں اسلامی ریاست کی توسیع و پھیلاؤ کے نتیجے میں سلطانی ادب ارتقائی مراحل میں داخل ہوا اور زمانہ مابعد کے ائمہ کرام رحمۃ اللہ علیہم اور سلطانی ادب کی تشکیل کنندگان نے جدید اور عصری مناہج کی روشنی میں سلطانی ادب کو آگے بڑھایا۔متاخرین میں سے جن لوگوں نے سلطانی ادب کی تدوین وترتیب میں نمایاں کردار ادا کیا ان میں ابن شحنہ رحمۃ اللہ علیہ، موفق الدین بغدادی رحمۃ اللہ علیہ،شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ،عبد الرحمن تاج رحمۃ اللہ علیہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

تحقیقی طریقہ کار:

مقالہ کی تحقیق کے لیے دستاویزی اور بیانی اسلوب اختیار کیا۔

۱۔ دستاویز میں اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کے آئین سے استفادہ کیا۔

۲۔ بیانیہ کو بیان کرنے کے لیے،اسلامی ریاست کے نظام پر اور جمہوری ریاست کے نظام پر مشتمل کتب،اور تحقیقی مقالہ جات سے استفادہ کیا۔

۳۔ اسلامی ریاست اور جمہوری ریاست کے مفکرین کی آراء کو شامل مقالہ کیا۔

۴۔ دوران تحقیق اسلام آباد کی لائبریریوں میں موجود کتب اور ڈکشنریز سے بھرپور استفادہ کیا۔

---

(۱) سورۃ النساء:۴/۵۸

۵۔ مقالہ کی ترتیب و تدوین میں اپنے نگران مقالہ کی ہدایات کو پیش نظر رکھا۔

۶۔ حوالہ جات اور دیگر طریقِ تحقیق میں یونیورسٹی کے فارمیٹ پر عمل کیا۔

۷۔ جدید تحقیق کے ذرائع انٹرنیٹ، ویب سائٹس اور اسلامی سافٹ ویئرز سے بھی استفادہ کیا۔

ابواب بندی

باب اول: اسلامی ریاست کا تعارف، آغاز وارتقاء، نظریاتی بنیادیں اور خصوصیات

فصل اول: اسلامی ریاست کا تعارف

فصل دوم: اسلامی ریاست کا آغاز وارتقاء

فصل سوم: اسلامی ریاست کی نظریاتی بنیادیں

فصل چہارم: اسلامی ریاست کی خصوصیات

باب دوم : جمہوری ریاست کا تعارف، آغاز وارتقاء، تشکیلی پہلو اور بنیادی نظریات۔

فصل اول: جمہوری ریاست کا تعارف

فصل دوم: جمہوری ریاست کا آغاز وارتقاء

فصل سوم: جمہوری ریاست کے تشکیلی پہلو

فصل چہارم: جمہوری ریاست کے بنیادی نظریات

باب سوم : اسلامی ریاست اور جمہوری ریاست کے اداروں کا جائزہ

فصل اول: اسلامی ریاست کے اداروں کا تعارف

فصل دوم: جمہوری ریاست کے اداروں کا تعارف

فصل سوم: اسلامی ریاستی اداروں کی امتیازی خصوصیات

فصل چہارم: جمہوری ریاستی اداروں کی خصوصیات

باب چہارم: اسلامی وجمہوری ریاستی اداروں میں سربراہان کے تقرر کے اصول وضوابط کا جائزہ

فصل اول: اسلامی ریاست میں اداروں کے سربراہان کے تقرر کے اصول

فصل دوم: جمہوری ریاست میں اداروں کے سربراہان کے تقرر کے اصول

فصل سوم: اداروں پر سربراہان کے اثرات اہلیت اور نااہلیت کے تناظر میں

فصل چہارم: اسلامی وجمہوری ریاست کے مابین تصادم اور اس کا حل

Abstract

My topic is as under:

In the light of the Islamic Virtual System, the conditions for appointment of heads in state institutions.

Islam is a complete rule. The state of Madina in Islam is the state whose ruler Muhammad Mustafa ruled for nearly a thousand years. The West of West has never been able to discuss the Islamic system rule, so it is important to present the world with the system of Islam today. The solution to the global civil, economic, moral and political crisis created in contemporary times again Looking for ideological principles.

And repeat the world that the Islamic system of world crisis is in rule if the heads of Islamic principles are set and the heads of themselves can adopt Islam's principles, the country can become an ideological ruler of an ideal rule.

The country's development and stability is not possible without adopting the rules and conditions laid down for the Islamic State. The world's system of governance and the Islamic State for the Islamic world, especially the world and worldly events resulting in global expeditions, is the case of Islam. I will try to explain in the light of Sunnah light. This article will be useful for many people.

My article consists of four chapters. The first chapter introduces the Islamic State, the beginning and evolution and characteristics. The second chapter introduces the democratic state, the beginning and evolution, the composition and the basic ideology. In the third chapter the research of the Islamic State and the democratic state institutions has been reviewed, while the

fourth chapter in Islamic and Muslim state-owned institutions has been analyzed the research of the rules of the appointment.

باب اول

اسلامی ریاست کا تعارف ،آغاز و ارتقاء، نظریاتی بنیادیں اور خصوصیات

فصل اول:

اسلامی ریاست کا تعارف

اسلامی ریاست کا تعارف:

کسی معاشرے کی بقاء کے لیے اس کی اجتماعی اقدار کا تحفظ، امن وسلامتی اور اس کا نظم وضبط ایک ناگزیر ضرورت ہوتی ہے اسی وجہ سے ریاست کا قیام انسانیت کی بنیادی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت ہمیشہ ادارۂ ریاست نے پوری کی ہے جسے آغازِ انسانیت سے آج تک کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکا ہے۔ اسی طرح انسانی معاشرے کی اس تشکیل و تہذیب میں مذہب کا کردار ہمیشہ سے بنیادی اور اہم رہا ہے۔ اسلام ایک جامع زندگی کے اصول ہونے کے اعتبار سے تمام شعبوں میں انسان کی راہنمائی کے ساتھ ساتھ بطور خاص انسانی معاشرے کی اجتماعی تنظیم سے متعلق واضح راہنمائی اور اصول فراہم کرتا ہے۔

اسلامی ریاست پر مزید بحث کرنے سے قبل اسلام اور ریاست کا مفہوم واضح ہونا ضروری امر ہے لہٰذا شروع میں اسلام اور ریاست کی الگ الگ تعریف کرتے ہوئے مفہوم واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور مفہوم واضح ہو جانے کے بعد اسلامی ریاست کا تعارف پیش کیا ہے۔

اسلام:

لغت کے اعتبار سے اسلام سلم سے لیا گیا ہے، جس کا مطلب اطاعت اور سلامتی ہے، اور لفظی اعتبار سے سلم کے "س" پر زبر اور زیر دونوں طرح سے پڑھتے ہیں۔

- "س" کو اگر زبر کے ساتھ پڑھتے ہیں سَلم (salm) تو اس کا معنیٰ امن وسلامتی کے ہیں۔
- "س" کو اگر زیر کے ساتھ پڑھیں سِلم (silm) تو اس کا معنیٰ فرمانبرداری، اطاعت، اور عبادت کے ہیں۔
- ان معانی میں سلم (salm) سلامتی وامن کے معانی میں قرآن مجید کی سورۃ الانفال میں بیان کیا گیا ہے۔

﴿ وَإِن جَنَحُواْ لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّهِ ﴾[1]

ترجمہ: اور اگر جھکیں امن (صلح) کے لئے تو تم بھی جھک جاؤ ان کے لئے اور بھروسہ رکھو اللہ پر۔

"س" پر زیر کے ساتھ سِلم (silm) فرمانبرداری اور اطاعت کے معانی میں سورۃ البقرۃ میں آیا ہے۔

﴿ ادْخُلُواْ فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ﴾[2]

ترجمہ: داخل ہو جائیں اسلام میں پورے کے پورے۔

---

(۱) سورۃ الانفال: ۸/ ۶۱

(۲) سورۃ البقرۃ: ۲/ ۲۰۸

اسلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی کتاب کا دین ہے۔یعنی اس کے پیروکاروں کو اہلِ کتاب کہا جاتا ہے۔

ریاست کی لغوی تعریف:

لغوی طور پر لفظ "ریاست "عربی زبان سے لیا گیاہے،یہ اردواور فارسی میں بھی انہی معانی میں استعمال ہوتاہے۔عربی میں ریاست کا مادہ"رائس "ہے،اور اسی سے الرئیس ہے اور رائس یارائیس کا اطلاق بلند مرتبہ یا اول المقام شخص پر ہوتاہے۔(۱)

انگلش میں ریاست کو state کہتے ہیں۔سٹیٹ "Status"سے ماخوذ ہے جو کہ یونانی زبان کا لفظ ہے۔(۲)اس لفظ کے بنیادی مفہوم میں حالت قائمہ اور ماحول کے ساتھ کئی متعدد معانی مذکورہ لفظ سے وابستہ ہیں۔البتہ ایک مخصوص سیاسی ہیئت حکومت یا منظم سیاسی شخصیت کے معنیٰ میں لفظ سٹیٹ کا استعمال تاریخی طور پر سولہویں صدی عیسوی میں شروع ہوا ہے۔(۳)اس سے پہلے سٹیٹ کا مفہوم ادا کرنے کے لیے دوسرے الفاظ کا سہارا لیا جاتا تھا۔چنانچہ یونانیوں کے ہاں بالعموم پولس"Polis"کا لفظ مستعمل رہا جس کے معنیٰ شہر (City)کے ہیں۔جو کہ اس امر کی علامت بنتی ہے کہ اس کے تصور ریاست شہر پر مبنی اور محدود تھا۔رومیوں نے ریاست کے مفہوم کو لفظ سیوسٹاس (Civitas) کے استعمال کے ذریعے قدرے وسعت دی۔رومیوں کے ہاں ایک دوسرا لفظ ری پبلیکا (Republica) بھی ملتا ہے جو ریاست کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔اس سے نہ صرف شہریت بلکہ (Republic)یعنی ایک قوم اور اس کے مفادات کی نشاندہی ہوتی ہے۔(۴)

ریاست کی اصطلاحی تعریف:

ریاست کی تعریف اردو دائرہ معارف اسلامیہ یوں بیان کرتی ہے کہ:

---

(۱)لسان العرب، محمد بن مکرم بن منظور افریقی مصری، دار صادر–بیروت،۶/۹۱

(2)Joseph, Shipley T. Dictionary of word origions, philosophical Lib, New York,p.334, 1945

(3)William Little H.W Fowler J. Coulson, the shorter Oxford English Dictionary . The Calrendon press London , p.205, 1965

(4)Bluntchli, johann Kaspar, The Theory of the State,p.52, 2000

ریاست: (رئاست)مادة رأس،رئاس،الرائس اور الرئیس اسی سے ہے۔عرب کہتے ہیں انت علیٰ رأس امرک ای علیٰ شرف منه یا انت علیٰ رئاس امرک ای اوّله۔[1]

امام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ریاست کو یوں بیان کرتے ہیں:

"اہلِ مدینہ سے مراد لوگوں کی وہ جماعت ہے جو ایک ہی نظام تمدن کے تابع اور پابندیوں میں باہم مل جل کر اجتماعی زندگی بسر کریں۔اس جماعت کو اگرچہ وہ مختلف شہروں میں رہتے ہوں ایک اجتماعیت سمجھا جاتا ہے۔"[2]

امام صاحب کے نزدیک ریاست کی آبادی اہلِ مدینہ کہلاتی ہے۔

مندرجہ بالا عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ ریاست کے عمومی معنٰی سرداری، سربراہی، حکومت اور اقتدار وغیرہ کے ہیں۔عربی، فارسی اور اردو میں یہ استعمال عام ہیں، مگر رئیس اور ریاست کے الفاظ کا مطلب ہر موقع پر لازمی طور سے اقتدارِ اعلیٰ نہیں۔رئیس مملکت سے نیچے افراد بھی صاحب الریاست بتائے گئے ہیں، جیسے خلیفۃ المأمون کے وزیر ابو العباس الفضل بن سھل کو صاحب الریاست کا لقب دیا گیا تھا، کیونکہ خلیفہ نے اسے وزارت اور قیادتِ عساکر ایسے دو اہم عہدے تفویض کر رکھے تھے

اسی طرح ہندوستان میں انگریزوں کے زمانے میں باج گزار ریاستیں موجود تھیں جو کسی طرح بااختیار نہ تھیں ان کے سربراہوں کو بھی صاحب الریاست تو کہا جاسکتا ہے لیکن اقتدارِ اعلیٰ ان کو حاصل نہ تھا۔ریاست کا اصطلاحی تصور ایک منظم اجتماعیت ہے۔اصطلاحی تصور فقہ السیاست کی کتب میں کم و بیش تفصیل سے بیان ہوا ہے اور بعض اوقات سیاست ،امامت، حکومت،(حاکمیت)ولایت، ملک، ملوکیت، سلطنت، مملکت وغیرہ کے مفہوم کے ساتھ ملتبس ہو کر قدرے مبہم بھی ہو جاتا ہے۔

اسلامی ریاست کے قیام کی اہمیت:

اسلامی تاریخ میں ریاست کے قیام کی اہمیت ہر دور میں رہی۔اللہ کے بھیجے گئے رسول و پیغمبر ہر دور میں اجتماعی قوت اسلام کے تابع کرنے کے لیے ہمہ وقت مصروفِ عمل رہے۔فکرِ اسلامی میں ریاست کے اہم ہونے کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ جس طرح وہ خالق ارض و سماوات اپنے نبی ﷺ کو یہ دعا سکھاتا ہے کہ:

---

(۱)اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۴۱۵/ ۱۰

(۲)حجۃ اللہ البالغہ، قطب الدین شاہ ولی اللہ، بیروت لبنان، ۴۴/ ۱

﴿وَقُلْ رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيرًا﴾[1]

ترجمہ: اور دعا کرو! اے میرے رب تو مجھے جس جگہ بھی داخل کر، صدق (سچائی) کے ساتھ داخل فرما اور جہاں کہیں سے بھی خارج کر صدق کے ساتھ خارج کر اور بنادے میرے لیے اپنی طرف سے اقتدار مددگار۔

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آیت ہجرت کے کچھ عرصہ قبل نازل ہوئی تھی۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"عن امير المؤمنين عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ أنه قال:إن الله ليزع باالسلطان مالا يزع بالقرآن" [2]

امیر المؤمنین حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ترجمہ: اللہ سلطان کی طاقت سے ان امور کو روک دیتا ہے جن کو قرآن نہیں روک پاتا۔

حضرت عثمان کا فرمان یہ واضح کرتا ہے کہ اسلام صرف وعظ و نصیحت سے قائم نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے قوت سیاسی بھی چاہئے جو اس کو عملی جامہ پہنائے۔

اسلام نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی ترتیب و تہذیب اور نشونما و ارتقاء کے لیے جو ادارے قائم کیے ان میں سے ایک سیاسی ادارہ ریاست بھی ہے۔ اسلامی زندگی کے لیے اسلامی اجتماعیت اور اسلامی اجتماعیت کے لیے اسلامی حکومت کے ناگزیر ہونے پر گویا امت کا اجماع ہے۔ اسلامی معاشرے کے تمام افراد کو مل کر یہ اختیار میسر نہیں کہ سب مل کر بھی ریاست کے ادارے ختم کر دیں۔

اسلامی ریاست اور اس کا امام:

اسی ضمن میں امام ماوردی نے وجوب الامامۃ کی بحث میں زور دیا ہے یعنی ایک اسلامی معاشرے کے لیے اسلامی ریاست اور اس کا امام ہونا لازم و ملزوم ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

---

(۱) سورۃ الاسراء: ۱۷/ ۸۰

(۲) شرح سنن ابی داؤد، عبد المحسن بن حمد بن عبد المحسن بن عبد اللہ بن حمد العباد البدر، مکتبہ شاملہ، ۱۲/ ۴۷۵

((الْإِسْلَامُ وَالسُّلْطَانُ أَخَوَانِ تَوْأَمٌ، لَا يَصْلُحُ وَاحِدٌ مِنْهُمَا إِلَّا بِصَاحِبِهِ، فَالْإِسْلَامُ أُسٌّ وَالسُّلْطَانِ حَارِسٌ، وَمَا لَا أُسَّ لَهُ مُنْهَدِمٌ، وَمَا لَا حَارِسَ لَهُ ضَائِعٌ)) [1]

ترجمہ: اسلام اور حکومت و سلطنت تو ماں شریک بھائی ہیں، دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، اسلام بنیاد ہے اور حکومت اس کی نگہبان ہے، جو بے بنیاد ہو وہ گر جاتی ہے اور نہ ہو جس کا محافظ وہ ضائع ہو جاتی ہے۔

امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

فرد کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ کے بندوں کے درمیان اپنی طاقت اور استعداد کے مطابق خلیفۃ اللہ کی ہے مگر ایک مرد اتنی استطاعت بھی نہیں رکھتا کہ وہ اپنے ذاتی حالات اور پھر اہل وعیال کے مصلح کی نگرانی بھی کرتا رہے کجا یہ کہ پورے قبیلے یا پوری بنی نوع انسان کے مصلح کا تحفظ کر سکے۔ جس کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے مشترک انسانی ضرورتوں کو مکمل کرنے کا بوجھ اجتماع پر ڈالا ہے اور اسی بناء پر زمین میں ریاست کا قیام عمل میں آیا ہے۔ [2]

دراصل اسلام اس تحریک کا نام ہے جو انسانی زندگی کی پوری عمارت کی تشکیل کرتی ہے اور اس میں دین و حکومت کی جدائی کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا اور اس کا دائرہ انفرادی زندگی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اجتماعی زندگی کی بنیادی اساس ریاست اور اس ریاست کے امام کو ضروری قرار دیا جاتا ہے پوری امت کے علماء اس پر متفق ہیں۔

"اتفق جميع اهل السنة وجميع مرجئة وجميع الشيعة وجميع الخوارج علىٰ وجوب الامامة" [3]

ترجمہ: تمام، سنی، شیعہ، خوارج اور مرجئہ کا وجوبِ امامت پر اتفاق ہے۔

امام ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

---

(۱) فضيلة العادلين الولاة لأبي نعيم، أبو نعيم أحمد بن عبد الله بن أحمد بن إسحاق بن موسى بن مهران الأصبهاني، دار الوطن، الرياض، ط، اولی، ۱۴۱۸ھ، ۱۹۹۷م، ۱/۱۵۳

(۲) الموافقات فی اصول الشریعۃ، امام شاطبی، ص: ۲/۱۷۷

(۳) الملل والنحل، ابو محمد علی بن احمد بن حزم الاندلسی، مترجم، مولانا عبد اللہ عمادی: میر محمد کتب خانہ آرام باغ کراچی، ۱۳۴۷ھ، ص: ۴/۸۷

"مقرر کرنا امام کا تمام شرائط کے ساتھ اہل اسلام پر واجب باالکفایہ ہے۔اور یہ حکم قیامت تک آنے والے مسلمانوں پر لاگو رہے گا۔"(۱)

قرآن مجید میں نظام ریاست کے دو تصور بیان ہوئے ہیں ایک آیت میں انبیاء علیہم السلام اور ملوک کے امتیاز کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا﴾ (۲)

ترجمہ: اے بنی اسرائیل تم میں نبی ہوئے اور بادشاہ بھی۔

یہ آیت اسلام کے نظریۂ حکومت کے لیے بھی فیصلہ کن اصول ہے۔

اسلامی حکومت کی تشکیل کی اساس ایک الٰہی وعدے کی شکل میں ہمیں درج ذیل آیت میں ملتی ہے:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ .....الخ﴾ (۳)

ترجمہ: اللہ وعدہ فرماچکا ہے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور نیکی کے اعمال کیے کہ البتہ ضرور بہ ضرور خلیفہ بنائے گا ان کو زمین میں جیسا کہ خلیفہ بنایا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے تھے اور البتہ ضرور بہ ضرور وہ ان کے واسطے جمادے گا ان کے دین کو جسے ان کو وہ امن امان سے تبدیل کر دے گا، وہ لوگ صرف میری بندگی کریں گے، میرے ساتھ کچھ بھی شریک نہیں کریں گے، اور جو لوگ ناشکری اور کفر کے مرتکب ہوں اس کے بعد تو یہی لوگ فاسق (نافرمان) ہیں۔

مذکورہ بالا آیت میں اسلامی ریاست کی روحانی بنیاد متعین ہوئی ہے یعنی اللہ رب العزت کی بندگی اور ممانعتِ شرک اسی روحانی اساس کی وجہ سے سارا نظام کار آگے بڑھتا ہے۔ اس ذہنی پاکیزگی کے بغیر ریاست اپنی غایتوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ اسلامی ریاست کی غایتیں کچھ تو ایسی ہیں جن سے نسلِ انسانی کی روحانی پاکیزگی قائم رکھی جا سکتی ہے، کچھ ایسی ہیں جو نظامِ تمدن کی کامیابی کے لیے ضروری ہیں مجموعی طور پر اسلامی ریاست ایک فلاحی ریاست ہے جس میں فرد و جماعت کو فوز و فلاح اور سعادت سے ہمکنار کرنا ہے۔ اس طرح اسلامی ریاست کا اصل مقصد اس اصلاحی اور فلاحی لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنانا ہے جو اسلام نے دنیا کی بہتری اور برتری کے لیے پیش کیا ہے۔ نیز

---

(۱) ازالۃ الخفاء، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، فصل اول، مقصد اول، قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی

(۲) سورۃ المائدۃ: ۵/ ۲۰

(۳) سورۃ النور: ۲۴/ ۵۵

ریاست کا فرض ہے کہ ان بھلائیوں کو فروغ دے، اچھائی کا حکم دیں اور بدی سے روکنے کا لازمی امر کرتے ہوئے ان برائیوں کو مٹائے جن سے کائنات کو پاک کرنا ضروری ہے۔ تنظیم تمدن کے لیے اسلام نے کچھ بنیادی انسانی حقوق متعارف کروائے ہیں۔ یہ حقوق اسلامی ریاست کے دستور کا ناقابلِ تغیر جز ہیں اور ان کی تنفیذ کا ذمہ دار ریاست کو ٹھہرایا ہے۔

انسانوں کے مل کر رہنے سے معاشرہ وجود میں آتا ہے اور مختلف معاشروں کا اجتماع ریاست کہلاتی ہے۔ ریاست کا وجود اسلام کے مرہون منت ہے۔ اسلام سے قبل بادشاہی اور قبائلی نظام رائج رہا۔ جب اسلام نے تصور ریاست یہ دیا کہ "حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ نیک، صالح، ایماندار مسلمان بطور امین اختیارات کا اہل ہے، جس کو مسلمانوں سے مشاورت کر کے چنیں گے جو دینِ حق کو نافذ کرنے کا پابند ہو گا"۔ اس اصول کی بنیاد پر جب بھی کوئی حکومت بنے گی وہ اسلامی حکومت ہو گی۔ اس کو خلافت، شورائیت یا جمہوریت میں سے جو نام دے لیا جائے۔ ہر وہ نظامِ حکومت جو اللہ کی نازل کردہ کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کی بنیاد پر قائم ہو اور رول ماڈل مملکتِ مدینہ ہو وہ اسلام کا پسندیدہ نظامِ حکومت ہے۔

کسی بھی اسلامی ریاست کا تصور اس اصطلاح میں مضمر ہے جس کو اسلام نے ریاست کی تعبیر کے لیے اختیار کیا ہے اسلامی تاریخ پر نگاہ رکھنے والا ہر شخص اس بات کا علم رکھتا ہے کہ اسلام نے اپنے قواعد واصولوں کی وجہ سے تشکیل پانے والی سیاسی تنظیم، ریاست، مملکت یا حکمرانی جیسے الفاظ نہیں اختیار کئے ہیں۔ اس کے برعکس امامت ،امارت اور خلافت کے الفاظ اختیار کئے ہیں۔ جس سے ریاست کے اسلامی تصور کو اجاگر کرنے کے لیے اولاً ان الفاظ پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور ان کے نقصانات کو سمجھنا بھی بہت اہم ہے۔

اسلامی ریاست کی اصطلاحات:

خلافت، امامت اور امارت کی اصطلاحیں ہماری فقہ و کلام کی بعض کتابوں میں بالکل مترادف اسلامی اصطلاحات کی حیثیت سے مستعمل ملتی ہیں جس کی وجہ سے کئی دفعہ اکثر چیزیں آپس میں خلط ملط ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر الگ الگ معنیٰ و مطلب متعین کرنے کی جدوجہد کریں تو یہ بات مکمل طور پر واضح ہے کہ ان اصطلاحات کے معانی و مفہوم جدا جدا ہیں۔

اصطلاحِ "خلافت" کا مفہوم:

اصطلاحِ خلافت اسلامی بنیادوں پر ایک قائم شدہ ریاست کے لیے بولا جاتا ہے۔

اصطلاح "امامت" کا مفہوم:

اسی طرح امامت یا امارت سے مراد وہ حکومت ہوتی ہے جو خلافت کے اداروں کی تنفیذ میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ باالفاظِ دیگر یوں سمجھیے سٹیٹ اور حکومت میں جو فرق ہے وہی امامت، امارت، خلافت میں ہے۔

تمہید سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سٹیٹ کے اسلامی تصور کو سمجھنے میں اولاً یہ حقیقت سامنے رکھنا لازمی امر ہے کہ اسلام میں ریاست فقط ایک ریاست نہیں ہے بلکہ وہ خلافت ہے۔ پھر ساتھ ہی یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھنی ہو گی کہ کوئی چیز صحیح طور پر معیاری صورت میں ہی لی جا سکتی ہے۔ اس لیے خلافت کی بھی یہاں فقط معیاری شکل ہی زیر بحث ہے، اس کی مختلف شکلیں، جن کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں، جو ہمارے لیے فائدہ مند نہیں ہو سکتیں۔

خلافت کی اصل فطرت انسانی کے اندر:

اس مسئلے پر غور و فکر کرتے ہوئے اولاً اس خلافت کا اندازہ فطرتِ انسانی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انسانوں کے معاشرے کے بیچ سے لگانا ہو گا۔ چونکہ اسلام مکمل ضابطہ کا حامل دین ہے اس لیے دین اسلام نے وحی الٰہی کے ذریعے ہمارے سامنے ایک واضح علم الانسان بھی رکھا، جو ہمیں اس کی بنیاد اور ابتداء بھی بتاتا ہے۔ جس کی روشنی میں اس کے بنیادی تصورات بھی سمجھ سکتے ہیں۔ ذیل میں اس انسانی علم کو قرآن سے راہنمائی لے کر اپنے الفاظ میں مختصر طور پر پیش کیا جاتا ہے۔[1]

قرآن میں خلافت کی ابتداء یوں بیان ہوئی ہے کہ اللہ ربّ العزت نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو اولاً فرشتوں کے سامنے اپنے ارادے کا اظہار کیا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ قائم کرنے ولا ہوں۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُون. ﴾[2]

ترجمہ: اور (اس وقت کا تذکرہ سنو) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، وہ کہنے لگے: کیا آپ زمین میں ایسی مخلوق پیدا کریں گے جو اس میں فساد مچائے، اور خون خرابہ کرے، حالانکہ ہم آپ کی تسبیح اور حمد و تقدیس میں لگے ہوئے ہیں، اللہ نے کہا کہ میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تمہارے علم میں نہیں ہیں۔

---

(۱) الغزالی، البر المسبوک فی نصائح الملوک، دار الکتب العلمیۃ، بیروت لبنان، ۱۹۸۸ء، ص ۲۸

(۲) سورۃ البقرۃ: ۲/ ۳۰-۳۳

فرشتوں کے علم میں چونکہ اللہ تعالیٰ کی پوری اسکیم نہیں تھی اس وجہ سے اس کے حلقہ میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر اللہ ربّ العزت کا اس نئی مخلوق کو پیدا کرنے کا مقصد محض تسبیح و تقدیس کی وجہ سے ہے تو وجود دینے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ تسبیح اور تقدیس کے لیے فرشتے موجود ہی تھے۔ یقیناً یہ انسان اللہ کے خلیفہ کی حیثیت میں زمین کا نظام سنبھالے گا یعنی وہ اللہ کی جانب سے اس کا خلیفہ ہو گا اور اللہ کی طرف سے کچھ اختیارات بھی تفویض ہوں گے۔ پھر یہیں سے ان کو یہ اندیشہ بھی لاحق رہا کہ انسان کو اختیار بھی حاصل ہوا یہ زمین میں انصاف کے بجائے فتنہ اور فساد برپا کرنے والا ہو گا۔ یہ فرشتوں کا خیال تھا جو انہوں نے اللہ کے آگے پیش کیا۔ اللہ نے ان کو جواب دیا یہ شبہ تمہیں صرف اس لیے ہوا کہ تمہیں میری سکیم کا پوری طرح علم نہیں ہے۔ اس کے بعد فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت کا مشاہدہ کرایا گیا پھر فرشتوں سے پوچھا گیا آدم اور اس کی ذریت کے متعلق تمہارا یہ خیال صحیح ہو تو بتاؤ یہ کون ہیں؟ یہ سارے کے سارے زمین میں فتنہ اور خون ریزی کے مرتکب ہیں یا اس میں نیکی و بھلائی پھیلانے والے بھی ہیں؟ انہوں نے نہایت احترام سے یہ تسلیم کیا کہ انہیں ان کے متعلق معلومات نہیں تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے جدِ امجد سے فرمایا کہ آپ اس نوری مخلوق کو ذریتِ آدم کے اسماء بتائیں (جن کے اسماء کا حضرت آدم علیہ السلام کو پہلے سے علم دے دیا گیا تھا) جس پر سیدنا آدم علیہ السلام نے ان کو ذریتِ آدم کے اسماء سے آگاہ کیا اپنی اولاد میں جو انبیاء، مجددین، مصلحین آنے والے تھے ان کا بتایا جس کی وجہ سے یہ حقیقت آشکارہ ہو گئی کہ جو منصب حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت کو مل رہا ہے، جس سے خرابی کے بھی اندیشے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس اختیار وارادہ کی حد بندی اور ذریتِ آدم علیہ السلام کی تربیت و اصلاح کے لیے اللہ کتاب و شریعت بھی اتارے گا اور انبیاء و رسل بھی بھیجے گا اس وضاحت سے ان پر اللہ کی سکیم آشکارہ ہو گئی جس سے ان کو اطمینان حاصل ہوا۔

خلافت کے ضمن میں:

اللہ نے اپنی کتاب میں انسانی تاریخ کی اوّلین تشکیل اور صورت کا فقط قصہ نہیں سنایا ہے بلکہ اس کا مقصد کچھ اہم و سیاسی حقیقتوں کی ابتداء سے آگاہ کرنا ہے خلافت کے بارے میں جو حقیقتیں اس سے ظاہر ہوتی ہیں وہ ذیل میں دی جارہی ہیں:

ا۔ خلافت کا شعور فطرتِ انسانی کی مقتضاء ہے یہ ایسی چیز نہیں کہ جو اسے باہر سے میسر ہو گئی ہو بلکہ اللہ نے خود اس کو اس کے لیے پیدا فرمایا از خود ہی اس کے اندر اس کا شعور ودیعت کیا ہے وہ ازل سے دنیا میں ہے اس شعور کے ساتھ ہے اور اسی نے انہیں سیاست اختیار کرنے پر اکسایا ہے۔ انسان نے سیاست بلا وجہ نہیں اختیار کی بلکہ یہ فطرت نے اس کو سکھایا ہے کہ اس کو مکمل کئے بغیر شخصیت مکمل نہیں ہو سکتی۔

۲۔فطرت انسان کو ایک بالکل خود مختارِ کل شخصیت کا منصب نہیں دیتی ہے۔بلکہ اس کا منصب اللہ کے خلیفہ کا ہے۔انسان کو ایک محدود حد تک اختیار ضرور دیا گیا ہے لیکن یہ اختیار اپنا نہیں بلکہ اللہ ہی کا عطا کردہ ہے۔یہی وجہ ہے انسان کا ہر وہ کام جائز ہو گا جو اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود میں ہو گا انسان اپنے ہر تصرف کے بارے میں اللہ کے سامنے جواب دہ ہے کیونکہ اصل مالک اور مستخلف ربّ العزت کی ذات ہے۔

۳۔اصل حاکمیت صرف خدائے بزرگ وبرتر کی ہے نہ کہ اس کی مخلوق کی اس کی تائید متعدد آیات مثلاً سورہ انعام اور سورہ یوسف سے ہوتی ہے:

﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ﴾ (۱)

ترجمہ: حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔

اس میں قانون سازی اور تصور کے جو اختیارات انسانوں کو حاصل ہیں وہ اللہ رب العزت کے نازل کیے ہوئے ارشادات کے تحت یا پھر ان دائروں کے اندر ہے جن میں خدائے بزرگ وبرتر نے اشرف المخلوقات کو آزاد چھوڑا۔

۴۔منشائے تخلیق تقاضا کرتا ہے کہ سب انسان اس منصب کے حق دار ہیں اس منصب کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے جو صلاحیتیں چاہیئے ہوتی ہیں وہ بھی سب انسانوں میں ودیعت ہیں۔انسان کو آزاد ہے وہ یہ منصب لے یا منصب لینے سے انکار کردے وہ صرف اللہ کے حقوق اور احکامات کو مان کر خلیفہ بن سکتا ہے۔اللہ نے انسان کی تخلیق کا مقصد اپنی عبادت بتلایا ہے۔جس طرح ربّ کائنات کا فرمان ہیں:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (۲)

ترجمہ: اور نہیں پیدا کیے جنّات وانسان مگر اپنی عبادت کے لیے۔

ہر ایک کو آزاد چھوڑا ہے عبادت پر بھی اور خلافت پر بھی کسی کو پابند نہیں کیا ہے۔

۵۔انسان خلیفہ کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں اللہ ربّ العزت کی رضا کی پابندی نہ کرے تو اس کا فتنہ وفساد میں مبتلا ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔

۶۔اللہ نے اس امر کو غیر واضح نہیں چھوڑا کہ اپنی زمین کے نظام میں کس چیز کو پسند کرتا ہے اور کس چیز کو ناپسند کرتا ہے۔یہ منصب اور خلافت کا مقتضاء ہے کہ وہ اپنے احکام وہدایت سے باخبر رکھنے کا نظام بنائے۔

---

(۱)سورۃ الیوسف:۱۲/۴۰

(۲)سورۃ الذاریات:۵۱/۵۶

۷۔اس منصب کی بنیاد قومیت، ملک، نسل، حسب و نسب جیسی باتوں پر نہیں بلکہ ایسی ریاست کی بنیاد اصول و نظریہ پر رکھی جاتی ہے جو کہ ایک اصولی ریاست کہلاتی ہے۔

۸۔خلافت کا نظام مساوات کے اصولوں پر قائم ہے خلافت کا حق کسی خاص گروہ، شخصیت یا طبقے کے لئے خاص نہیں ہے بلکہ ہر شخص خلیفہ بننے کا اہل ہے صرف ترجیح اہلیت اور صلاحیت کی بنا پر لوگوں سے مشورہ اور ان کی رائے سے دی جاتی ہے۔

اسلامی ریاست کی بنیاد بھی اسی باہمی مشاورات پر رکھی گئی ہے۔جیسے اللہ کا فرمان ہے:

﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾ (۱)

ترجمہ:اوراموران کے آپس کے مشورے سے ہوتے ہیں۔

اسلامی ریاست کے بنیادی اصول شوریٰ کی جانب مسلمانوں کی راہنمائی کی غرض سے ربِ کائنات نے اپنے پیارے پیغمبر ﷺ سے فرمایا:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ (۲)

ترجمہ:اور ان سے (اہم) معاملات میں مشورہ لیتے رہو۔

خلافت کے لیے سنتِ الٰہی:

چونکہ خلافت اختیار پر مبنی ہے نہ کہ جبر پر جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا تو اس اختیار کا مقتضاء ہے کہ اللہ اقوامِ عالم کو زمین پر اقتدار بخشے اور یہ اقتدار بخشنے سے ان کی آزمائش کرے کہ وہ زمین میں خود کی مرضی کرتے ہیں یا پھر خدا کی قائم کردہ حدود کے پابند رہتے ہیں۔جو قومیں اس اقتدار کو پا کر خدا کی بغاوت کی راہ اختیار کرتی ہیں وہ نافرمان گردانی جاتی ہیں آزمائش کی مقررہ معیاد گزر جانے پر اسے ختم کر دیا جاتا ہے۔اللہ کی اس سنت کا تذکرہ قرآنِ کریم کی سورۃ یونس کی آیات ۱۳۔۱۴ میں اس طرح فرمایا ہے:

﴿وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ----.﴾(۳)

ترجمہ:اور ہلاک کیا ہم نے تم سے پہلی قوموں کو جب ظلم کی مرتکب ہوئیں وہ قومیں حالانکہ ان کے رسول واضح نشانیوں کے ساتھ ان کے پاس آئے لیکن وہ ایمان نہ لائے۔ایسے ہی

---

(۱)سورۃ الشوریٰ:۴۲/۳۸

(۲)سورۃ آل عمران:۳/۱۵۹

(۳)سورۃ یونس:۱۰/۱۳،۱۴

انجام کرتے ہیں ہم مجرموں کا۔ پھر ان کے بعد ہم نے زمین میں تمہیں خلیفہ بنایا تا کہ دیکھیں کہ تم کیسا عمل کرتے ہو؟

خلافت کے حقیقی اہل:

یہ خلافت بالقوہ بیشک سب ہی انسانوں کو میسر ہے، لیکن بالاستحقاق یہ فقط ان کو میسر ہے جو اس کے تقاضے پورے کر سکیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ ربّ العزت نے واضح طور پر خود کا خلیفہ قرار دیا، کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی حکومت اللہ تعالیٰ کے احکامات کے تابع تھی۔ اسی ضمن میں قرآن مجید میں ہے:

﴿يٰدَاوٗدُ إِنَّاجعلناک خليفةً فی الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بين الناس بِالْحَقِّ﴾ (۱)

ترجمہ:: اے داؤد علیہ السلام بیشک بنایا ہم نے تم کو اپنا نائب زمین میں، پس آپ عوام الناس کے بیچ عدل کے ساتھ فیصلہ کریں۔

اصل میں خلافت کے حقیقی اہل در حقیقت انبیاء علیہم السلام ہیں یا وہ جو انبیاء علیہم السلام کے طریقے پر اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ بر آ ہوں۔ جو انسان اللہ کی اطاعت وعبادت کے لیے منظم ہو جاتے ہیں اللہ انہیں خلافت کی خاص خلعت عطاء کرتا ہے چنانچہ سورہ نور آیت ۵۵ میں یہ بات یوں بیان ہوئی ہے:

﴿وَعَدَاللّٰهُ الَّذِينَآ مَنُوامِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِخَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا---الخ﴾ (۲)

ترجمہ: اللہ وعدہ فرما چکا ہے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور نیکی کے اعمال کیے کہ البتہ ضرور بہ ضرور خلیفہ بنائے گا ان کو زمین میں جیسا کہ خلیفہ بنایا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے تھے، اور البتہ ضرور بہ ضرور وہ ان کے واسطے جمادے گا ان کے دین کو، جسے ان کو وہ امن امان سے تبدیل کر دے گا، وہ لوگ صرف میری بندگی کریں گے، میرے ساتھ کچھ بھی شریک نہیں کریں گے، اور جو لوگ ناشکری اور کفر کے مرتکب ہوں اس کے بعد تو یہی لوگ فاسق (نافرمان) ہیں۔

خلافت کا بگاڑ:

یہی خلافت کی معیاری صورت ہے اس وقت تک جب تک یہ ان خصوصیات پر قائم رہے، یہ زمین پر اللہ کی رحمت ہے۔ یہ خصوصیات اگر ناپید ہو جائیں تو یہ اس کی خرابی کی صورتیں ہوں گی جو اس کی خرابی کے مختلف

---

(۱) سورۃ ص: ۳۸/۲۳

(۲) سورۃ النور: ۲۴/۵۵

درجے ہیں۔ ایک خاص حد تک یہ خرابی خلافت کے دائرے سے اسے نہیں نکالتی لیکن اگر یہ خرابی خلافت کی بنیادی خصوصیات معدوم کر دے تو پھر یہ باقی نہیں رہتی بلکہ فتنہ اور فساد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اسلامی ریاست اور عام ریاست میں فرق:

اس تفصیل کے بعد یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہا کہ ایک عام ریاست اور ایک اسلامی ریاست (بالفاظ دیگر خلافت) کچھ باتوں میں مشترک ہوتی ہے اور کئی پہلوؤں سے الگ ہوتی ہے۔ علامہ کرمانی نے انسان کی یہ جو تعریف کی ہے کہ "الإنسانُ: حيوان ناطقٌ"[1] یعنی یہ حیوان ناطق ہے۔ یہ تعریف جس طرح ایک غیر مسلم کے لیے بولی جاتی ہے ویسے ہی ایک مسلم پر بھی صادق ہے۔ کیونکہ اپنے دائروں میں ایک ہی طرح کی ضروریات و داعیات رکھتے ہیں، لیکن باوجود یہ کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ایک مسلم اور ایک غیر مسلم میں واضح فرق ہے۔ ایک غیر مسلم کی زندگی کے اصول الگ ہیں اور ایک مسلم کے الگ ہیں اور ایسے ہی اسلامی اور غیر اسلامی ریاست میں بھی واضح فرق ہے۔ جبکہ بظاہر ان کے ڈھانچے اور اجزائے ترکیبی ایک جیسے ہیں جیسے غیر اسلامی ریاست کو اپنی بقاء کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ اس کو بہترین معاشرہ ملے اور ایسا علاقہ ہو جس میں وہ اندرونی طور پر بااقتدار اور بیرونی حیثیت سے خود مختار ہو، ان کے پاس ایک سیاسی ادارہ (حکومت) ہو، جو اس حکومت کے فیصلوں کو نافذ کر سکے جو اس حکومت کے مقاصد کی تکمیل کر سکے۔ ایسے ہی اسلام کے نظام پر مبنی ریاست بھی اپنے وجود کی بقاء کے لیے ان تمام چیزوں کی ضرورت ہے اس نظریے پر دونوں ریاستیں ایک ہیں لیکن مقاصد اور بنیادی اصولوں میں دونوں ریاستوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ جو کہ آگے چل کر اسلامی ریاست کی خصوصیات اور بنیادی نظریات اور جمہوری ریاست کی خصوصیات اور بنیادی نظریات میں واضح ہو گا

---

(۱) تحقیق الفوائد الغیاثیۃ، محمد بن یوسف بن علي بن سعید، شمس الدین الکرمانی، مکتبۃ العلوم والحکم، المدینۃ المنورۃ - المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، طبع اولیٰ، ۱۴۲۴ھ، ص: ۲۴۵/۱

فصل دوم:

اسلامی ریاست کا آغاز وارتقاء

اسلامی ریاست کا آغاز وارتقاء:

مدینہ کی اسلامی ریاست سے ماقبل بھی کئی اسلامی ریاستیں قائم ہوئی ہیں جن میں سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام اور سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام کی ریاستیں قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن زیرِ نظر مقالہ مدینہ کی ریاست، جہاں نبی کریم ﷺ نے اسلام کے نظام حکومت پر مشتمل ریاست کی بنیاد رکھی، مدینہ کی ریاست کے آغاز اور ارتقاء کو مدِّ نظر رکھ کر ترتیب دیا ہے۔

سیرت النبی ﷺ کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف اسلام کو لوگوں تک نہیں پہنچایا بلکہ اسے بطورِ نظام نافذ بھی کیا۔ پس مکی دور کی تیرہ سالہ جدوجہد کے نتیجے میں پہلی اسلامی ریاست مدینہ میں قائم ہوئی جس کی وجہ سے اسلام کے پھیلاؤ کا آغاز ہوا۔ اسلامی ریاست کا قیام کوئی ایسا واقعہ نہ تھا کہ جو جدوجہد کی راہ میں خود بخود وقوع پذیر ہو گیا بلکہ مملکت کی بنیاد رکھنا جو اسلام کو نافذ کرے اور دعوت و جہاد کے ذریعے سے دنیا تک لے جائے، جو کہ رسول اللہ ﷺ کے مکی دور کے ہدف تھے۔ رسول کریم ﷺ کی قائم کردہ اسلامی ریاست کو جاننے سے پہلے اس بات کو جاننا ضروری ہے کہ پہلی اسلامی ریاست کا نکتہ آغاز کیا تھا، کیونکہ رسول کریم ﷺ کے وہ اعمال جو آپ ﷺ نکتہ لہٰذا سے ماقبل سرانجام دیے وہی ریاست کے قیام کے لیے نمونہ ٹھہریں گے جبکہ اس نقطہ کے بعد کے اعمال اس ریاست کے پھیلاؤ اور استحکام کے لیے دلیل قرار پائیں گے۔ یہ ایک مشہور و معروف بات ہے کہ مدینہ میں اسلامی حکمرانی کی ابتداء اسی وقت ہو گئی تھی جب نبی کریم ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمائی۔ تاہم بعض لوگوں کا نکتہء نظر یوں بھی ہے کہ یہ ریاست مدینہ فتح مکہ کے بعد ہی قائم ہوئی تھی جب رسول اللہ ﷺ کو مکمل اتھارٹی ملی۔ ان نکات کا جو عموماً فتح مکہ کے بعد مکہ یا مدینہ کو پہلی اسلامی ریاست تسلیم کرنے کے ضمن میں پیش کئے جاتے ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

پہلا نکتہ:

ہجرت کا مقصد مسلمانوں کی تعداد اور قوت میں اضافہ اور انہیں منظم کرنا تھا تاکہ وہ جہاد کے ذریعے حکومت حاصل کریں۔

دوسرا نکتہ:

یہودی اپنے معاملات میں آزاد تھے جس کے سبب نبی کریم ﷺ کو میثاقِ مدینہ کرنا پڑا تاکہ قوت حاصل ہو، میثاقِ مدینہ اس بات کا بین ثبوت ہے۔

تیسرا نکتہ:

فتح مکہ پر اسلام کی حکمرانی قائم ہوئی اور انقلاب کی تکمیل ہوئی۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا:

﴿وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ (۱)

ترجمہ: اور مکمل کر دیا میں نے تم پر اپنی نعمت کو اور دینِ اسلام کو تمہارے لیے پسند کیا ہے۔

پہلے نکتہ کا جائزہ: ہجرت صرف اسلامی دعوت کے لیے جگہ کی تبدیلی کا نام نہیں بلکہ دعوت میں ایک اہم موڑ ہے۔ کیونکہ اس واقعہ کے بعد قرآنی آیات کی نوعیت اور احکامات کا زاویہ بدل گیا۔ خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب اسلامی کیلنڈر کی بنیاد رکھی تو ہجرتِ مدینہ کو ہی اس کا نقطہ آغاز بنایا۔ مکی آیات مختصر ہیں اور ان کا ہدف کفارِ مکہ کے باطل خیالات، عقائد اور نظامِ حیات کو نشانہ بنانا تھا بشمول اس کے کہ انہیں اسلام کی دعوت دی جائے۔ اس کے برعکس مدنی سورتیں معاشرے کی تنظیم اور اجتماعی احکامات کے متعلق ہیں جو اپنے نفاذ کا مطالبہ کرتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ مکہ کے اندر جس چیز کی دعوت دیتے تھے وہ واضح تھی۔ کہ لا الٰہ الّا اللہ محمّد رسول اللہ کے کلمہ کو معاشرے کی پوری ہئیت پر غالب کرنا چاہتے تھے۔ فکری اور سیاسی جدوجہد جس میں باطل افکار کو چیلنج کرتے ہوئے حق سامنے لایا گیا۔ ساتھ میں مکہ کے سرداروں تک دین کا پیغام لیکر جانے کا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ حلقہ اسلام میں داخل ہو کر حکومت رسول اللہ ﷺ کے حوالے کر دیں تاکہ اسلامی نظامِ زندگی کو کارزارِ حیات میں زندہ کیا جائے۔ اسی بنا پر قریش کو مسلسل یہ ڈر تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت اگر عام ہوئی اور عمومی طور پر لوگوں نے قبول کیا تو مکہ مکرمہ کی سیاست و حکومت ان کے ہاتھ میں نہیں رہے گی۔ اس کا تذکرہ وقتاً فوقتاً ان کی زبانوں پر رہا۔ جب نبی کریم ﷺ کے خلاف قریش کے سرداروں کا آخری جلسہ دار الندوہ میں ہوا جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے کہ آپ ﷺ کے متعلق (۱) قید کرنے (۲) جلاوطن کرنے (۳) جان سے مار دینے کی تجاویز زیر بحث آئیں تو ملک بدر کر دینے کی تجویز پر ایک بڑے سردار نے اس مجلس میں کہا کہ اس طرح تو محمد ﷺ بہت سے لوگوں کو ساتھ ملا لیں گے اور مکہ پر حملہ کر کے تم سے تمہاری حکومت چھین لیں گے۔ چنانچہ عملاً ایسا ہی ہوا اور صرف ۸ سال کے وقفے کے بعد فتح مکہ ہوا۔

ابو طالب کے فوت ہونے سے پہلے قریش کے معززین کا ایک بڑا وفد ان سے ملاقات کے لیے آیا اس میں جناب ابو طالب سے کہا گیا تھا کہ اپنے بھتیجے کے ساتھ ہمارا معاہدہ کرا دیں تاکہ حالات زیادہ نہ الجھیں جس پر آپ

---

(۱) سورۃ المائدۃ: ۵/۳

ﷺ نے فرمایا میری دعوت تسلیم کرلو جس سے نہ صرف پورے عرب کی حکمرانی میسر ہوگی بلکہ عجم بھی تمہارے زیرِ سایہ ہوگا۔[1]

یہ کسی سیاستدان کی ڈپلومیٹک اسٹیٹمنٹ نہیں تھی بلکہ اللہ کے صادق پیغمبر کا وعدہ تھا جو پورا ہوا۔

طائف بھی نبی کریم ﷺ اسلام کا پیغام لے کر روانہ ہوئے سردارانِ طائف کو اسلام اور دین کی نصرت کی طرف بلانے کی غرض سے۔ مکی دور کا یہ موڑ اہم ترین موڑ ہے جب رسول اللہ ﷺ تقریباً چالیس قبائل کے پاس دعوت و نصرت کے حصول کے لیے گئے۔ بہت سارے واقعات اس کی نشاندہی کرتے ہیں کہ قبائل کے پاس جانا مدد و نصرت کے لیے تھا۔ ابنِ ہشام رحمۃ اللہ علیہ اپنی سیرت کے باب "قبائل کو دعوتِ اسلام" میں رقمطراز ہیں:

> "نبی کریم ﷺ جب قبیلہ بنو عامر میں پہنچے تو ایک شخص ہیرہ بن فراز نے کہا" ہم آپ کی مدد کریں اور اللہ آپ کو دشمنوں پہ غلبہ عطا کردے تو کیا آپ کے بعد ہم حکومت سنبھال لیں۔" رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہوا کہ "امر فقط اللہ جلّ شانہ کے لیے ہے اللہ جسے پسند کرے گا دے دے گا۔ لیکن بنو عامر رسول اللہ ﷺ کے جواب پر مدد کرنے سے انکاری ہوگئے۔"[2]

حضور نبی کریم ﷺ کے فرمان کے اندر لفظ امر سے مراد اتھارٹی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اس قبیلے سے اتھارٹی و فیصلے کی طاقت مانگ رہے تھے۔ اس کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

> "رسول اللہ ﷺ مکہ لوٹے تو قریش پہلے سے بھی زیادہ شدید مخالف ہوئے۔ بایں سبب آپ ﷺ نے حج کے دوران مختلف قبیلوں کے ساتھ رابطہ فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ انہیں بتاتے کہ وہ اللہ سبحانہ کے رسول ہیں اور قبائل پر ایمان لانے کے لیے زور دیتے کہ وہ ایمان بھی لائیں اور حفاظت بھی کریں یہاں تک کہ اللہ اُسے ظاہر کردے جسے اس نے اتارا ہے۔"[3]

آپ ﷺ کا آخری جملہ واضح کرتا ہے کہ آپ انہیں ایک ایسی چیز کی طرف پکار رہے تھے جو مکہ میں پوری نہیں ہو پائی تھی یعنی شریعت کا پوری طرح ظاہر اور غالب ہونا۔ ایک نظامِ زندگی اسی وقت واضح و ظاہر ہوتا ہے جب اس کے اجتماعی پہلوؤں کو معاشرے پر نافذ کیا جائے تاکہ حقیقی مثال موجود ہو ورنہ وہ دھندلا سا جاتا ہے اور حقیقت سے دور ہوتا ہے جو کتابوں میں تو محفوظ ہوتا ہے مگر عملی میدان سے غائب ہوتا ہے۔ اسی ہدف کے حصول کے لیے

---

(۱) سیرت ابن ہشام، ۲/ ۳۴، ۳۵

(۲) ایضاً

(۳) سیرت ابن ہشام، ۲/ ۴۰۔۴۱

مکہ چھوڑا اور مدینہ چلے گئے۔ اگر محض تحفظ ہی کی تلاش تھی تو حبشہ ہجرت کرنے کو اچھی جگہ تھی اور مدد و نصرت کے لیے بھی اچھی جگہ تھی جہاں اتنی سختیوں اور کڑوے جوابات کو برداشت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ مزید براں ہجرت کے لیے اس نصرت کا ہر قسم کے سمجھوتے سے بالاتر اور مکمل ہونا شرط تھا، تاکہ حکومت اسلام کو مکمل نافذ کرے اور ہر سمت سے اس کی حفاظت کرے۔ اسی سبب سے رسول اللہ ﷺ نے بنی شیبان سے مدد نہیں لی جنہوں نے عربوں سے تحفظ کا تو وعدہ کیا لیکن وہ فارس سے حفاظت یا مدد دینے پر آمادہ نہ تھے۔ سخت موسم، کٹھن سفر اور ایذاء کے باوجود آپ ﷺ کا نصرت طلب فرمانے کا عمل جاری رکھنا ثابت کرتا ہے کہ یہ عمل اللہ کی طرف سے تھا نہ کہ رسول اللہ ﷺ کی اپنی خواہش تھی۔

فتح الباری کے اندر معروف سند کے ساتھ علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

ترجمہ: جس وقت اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو عرب قبیلوں تک پیغام لے جانے کا امر دیا تو میں اور ابو بکر رضی اللہ عنہ آپ کے ہمراہ منیٰ گئے حتیٰ کہ عرب قبیلوں تک جا پہنچے "۔ لہٰذا نصرت طلب کرنے کا امر اللہ نے دیا تھا تب تک رسول اللہ ﷺ نے یہ عمل جاری رکھا جب تک یہ عمل پایہء تکمیل تک نہیں پہنچ گیا یعنی جب انصار نے اسلام قبول کر کے آپ کو نصرت دے دی۔ اسی بنا پر انہیں انصار کہا گیا یعنی مدد کرنے والے۔[1]

جیسے اللہ نے قرآن میں فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ آوَوْا وَنَصَرُوا﴾[2]

ترجمہ: جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی۔

اپنی سمت میں استحکام اور یکسوئی رکھتے ہوئے آپ ﷺ بالآخر اوس اور خزرج کے قبیلوں سے ملے۔ سیرت ابنِ ہشام رحمۃ اللہ علیہ میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ:

"جس وقت اللہ نے اپنے دین کو غالب، نبی ﷺ کو معزز و کامیاب کرنے اور وعدوں کو پورا کرنا چاہا تو اس کے لیے اسباب بھی مہیا کر دیئے۔"[3]

اسی طرح سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۸۰ میں ہے:

---

(۱) فتح الباری شرح صحیح بخاری، آحمد بن علی بن حجر ابو الفضل العسقلانی الشافعی، دار المعرفہ ۱۹۸۰ء، بیروت، ص:۱۳۷

(۲) سورۃ الانفال:۸/۷۲

(۳) سیرت ابن ہشام، ۲/۵۲

﴿وَقُلْ رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيرًا﴾[1]

ترجمہ: اور دعا کرو! اے میرے رب تو مجھے جس جگہ بھی داخل کر، صدق (سچائی) کے ساتھ داخل فرما اور جہاں کہیں سے بھی خارج کر صدق کے ساتھ خارج کر اور بنادے میرے لیے اپنی طرف سے اقتدار مددگار۔

مسند احمد میں عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ:

((كان رسول اللهِ بِمَكَّةَ ثُمَّ أُمِرَ بِالْهِجْرَةِ وَأُنْزِلَ عَلَيْهِ))[2]

تھے اللہ کے رسول ﷺ مکہ میں پھر انہیں حکم ہوا ہجرت کا اور ان پر یہ آیت اتری۔

ایسا ہی ابنِ کثیر نے اس آیت کے متعلق اپنی تاریخ البدایہ و النہایہ کے باب "رسول اللہ ﷺ کا مکہ سے مدینہ منورہ ہجرت کرنے کے اسباب" کے تحت رقم کیا ہے مذکورہ آیت میں لفظ سلطان کا معنیٰ اتھارٹی ہے۔ تفسیر ابنِ کثیر میں ہے کہ: "اپنے رب سے سلطنت کی دعا کرو اور مدد کی دعا کرو۔ پیغمبر خدا ﷺ جانتے تھے کہ دین کا محفوظ و مستحکم ہونا بغیر سلطنت ممکن نہیں ہے۔ اسی خاطر انہوں نے سلطاناً نصیرا کی دعا کی تاکہ وہ اللہ کے دین کو قائم کر سکیں، اللہ کی کتاب کو، اس کی حدود کو اور فرائض کو... اس کے لیے حق اور قوت دونوں کی ضرورت ہے تاکہ دشمنانِ حق ڈرے رہیں۔[3]

معلوم ہوا کہ ہجرت کے مقاصد میں دین کا نفاذ اور دعوت کے طرز میں یکسر تبدیلی یعنی معاشرے کی تشکیل اور ریاست کا قیام کرنا تھا، ایک ایسا معاشرہ جو دعوت کا علمبردار بنے۔ مدینہ میں ریاست کا قیام مندرجہ ذیل آیت سے بھی ثابت ہے:

﴿الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾[4]

---

(۱) سورۃ الاسراء: ۱۷/ ۸۰

(۲) مسند احمد، امام احمد بن حنبل، مؤسسۃ الرسالہ، ۲۰۰۱ء، مُسْنَدُ عَبْدِ اللهِ بْنِ الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، ۳/ ۳۱۷

(۳) تفسیر القرآن العظیم، ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر قرشی بصری ثم الدمشقي، دار طیبۃ للنشر والتوزیع، ط، ثانی، ۱۴۲۰ھ، ۵/ ۱۱۱

(۴) سورۃ الحج: ۲۲/ ۴۱

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پاؤں جمادیں (بااختیار بنادیں) تو یہ پوری پابندی سے نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ دیں، اور اچھے کاموں کا حکم کریں اور برے کاموں سے منع کریں، تمام کاموں کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔

ابنِ کثیر فرماتے ہیں: "حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آیتِ مبارکہ ہمارے لیے نازل ہوئی کیونکہ ہم جبراً اپنے علاقوں سے نکالے گئے تھے، پھر اللہ نے ہمیں سلطنت دی۔"(۱)

اسی طرح امام احمد رحمۃ اللہ علیہ جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انصار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ بنیاد دریافت کی جس پر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیعت دینے والے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((تُبَايِعُونِي عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي النَّشَاطِ وَالْكَسَلِ، وَعَلَى النَّفَقَةِ فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ، وَعَلَى الْأَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ، وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَعَلَى أَنْ تقُولُوا))(۲)

ترجمہ: ہر حال میں سننا اور اطاعت کرنا۔ ۲۔ مفلسی اور خوشحالی ہر حال میں خرچ کرنا۔ ۳۔ حق بات کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔ ۴۔ اللہ کے راستے میں ملامت کرنے والے کی ملامت کی فکر نہ کرنا۔ ۵۔ اگر میں تم سے مدد مانگوں تو اس چیز سے میری حفاظت کرنا جس سے اپنے بیوی بچوں کی کرتے ہو۔ اگر تم نے ایسا کر لیا تو تمھارے لیے جنت ہے۔

مندرجہ بالا حدیث میں انصار نے اس بات پر بیعت کی کہ وہ ہر حال میں اطاعت کریں گے۔ یہ اطاعت ان احکامات کی اطاعت تھی جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بطور حاکم جاری کریں گے۔ مزید برآں تمام مسلمانوں سے بیعت نہ لینا اور صرف یثرب سے آئے ہوئے لوگوں سے بیعت لینا اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ بیعت ایک خاص مقصد کے تحت تھی۔ یہ بیعت صرف جہاد کی بیعت نہیں تھی گویا کہ دین کا مادی قوت سے تحفظ کرنا اس کا ایک حصہ تھا۔ اس بیعت کا نام بیعت الحرب اس لیے تھا کیونکہ یہ ہر سرخ وسیاہ سے لڑنے کا عقد تھا، جو اسلامی دعوت میں روڑے اٹکائے۔ اس کے باوجود کہ جہاد کا حکم نہیں اترا تھا۔ نتیجتاً بیعت کا فوری مقصد حکومت کا منتقل ہونا تھا۔ جہاد یقیناً دین کا اہم حکم اور ریاستِ خلافت کی خارجہ پالیسی کا لازمی حصہ ہے تاکہ اسلام کی دعوت کے راستے میں حائل رکاوٹوں کو ہٹایا جاسکے۔ جب اسلامی ریاست پھیلتی ہے تو وہ دعوت و جہاد ہی کے ذریعے پھیلتی ہے اور نئی سرزمینوں پر اسلام کا جھنڈا بلند ہوتا ہے۔ لیکن جہاد کے اس تصور کو عقبہ کی دوسری بیعت کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے اور ایک ایسی ریاست کے قیام کے ساتھ بھی جو اسلام کے بے شمار فرائض کو نافذ کرتی ہے اور جہاد بھی کرتی ہے۔

---

(۱) تفسیر ابن کثیر، ابو الفداء عماد الدین، حافظ ابن کثیر، دار الکتب العلمیۃ بیروت، ۱۴۱۹ھ، ۵/۳۸۳

(۲) مسند احمد، امام احمد بن حنبل، مسند جابر بن عبد اللہ، ۲۳/۲۳

دوسرے نکتے کا جائزہ: دوسرا نکتہ یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینہ کے اندر طاقت نہ تھی اسی لیے یہودی اپنے معاملات میں آزاد تھے اور میثاقِ مدینہ اس بات کا ثبوت ہے۔ اس غلط فہمی کا ازالہ: اگر نظام معاشرے میں نافذ نہ ہو رہا ہو تو وہ محض ایک اچھا خیال ہے جو تدریسی لحاظ سے تو زبردست ہو گا مگر حقیقت میں غیر موئثر ہو گا۔ اسلام اس لیے آیا تاکہ لوگوں کے تعلقات اور معاشرے کو اپنے نظام کے تحت منظم کرے اور مخلوق کو مخلوق کی عبدیت سے آزاد کر کے خالق رب العزت کی غلامی کی طرف موڑے اور ایسا زندگی کے ہر کل اور جز پر ہو، اسی وجہ سے بحیثیتِ حکمران ہجرت کی۔ مکہ کی زندگی سے برعکس جہاں مسلمان محکوم تھے اور معاشرہ کفر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا مدینہ میں اسلام غالب اور ہر خاص و عام کے خیالات پر حاوی تھا، اسی وجہ سے مکی اور مدنی سورتوں کا خطاب اور اسلوب بھی مختلف ہے۔ اس بات کی ایک اور دلیل منافقین کی موجودگی ہے جو مکہ میں ظاہر نہیں ہوئے تھے کیونکہ جو لوگ مکہ میں کھلے عام اسلام کی مخالفت کرتے تھے انہیں مدینہ میں اسلام کے غلبے کی وجہ سے آستین میں چھپ کر وار کرنا پڑتا۔ یوں عبد اللہ بن ابی کو بھی سرنگوں ہونا پڑا اور اس نے اسلام قبول کرنے کا جھوٹا ڈھونگ رچایا۔ نبی کریم ﷺ نے مدینہ آتے ہی مسجد تعمیر کی، یہ باہمی اختلافات کو حل کرنے، مشورہ اور دیگر فیصلوں کی جگہ تھی۔ مسلمان رسول اللہ ﷺ سے ہر عمل کے متعلق پوچھتے اور نبی کریم ﷺ ان کو دیکھتے، رسول اللہ ﷺ حاکم مدینہ کے ساتھ ساتھ سپہ سالار بھی اور قاضی بھی تھے۔ مدینہ کی معاشی طاقت یہود تھے۔ وہ اوس اور خزرج کے درمیان نہ ختم ہونے والے تنازعات پیدا کرتے اور جب یہ قبیلے باہم دست و گریباں ہو جاتے تو یہود ان کا معاشی استحصال کرتے۔ نبی کریم ﷺ کا مدینہ آنا فقط یہود کی اس چالاکی کے اختتام کی گھنٹی نہ تھی بلکہ ان کی نام نہاد مذہبی اجارہ داری کے خاتمے کا اعلان بھی تھا، جس کی وجہ سے دیگر قبیلے انہیں عزت دیتے۔ یہود کے بڑے قبیلوں میں بنو قینقاع مدینہ کے اندر بسا ہوا تھا جب کہ بنو نضیر، خیبر اور بنو قریظہ مدینہ سے باہر آباد تھے۔ مدینہ کی علاقائی اور سیاسی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے دو حدود مقرر کیں، ایک حرہ شرقیہ دوسرا حرہ غربیہ۔ مدینہ کے چار اطراف میں سے ایک طرف کھجور کے گھنے باغات تھے جب کہ دوسری طرف ریگستانی پہاڑوں کے سلسلے۔ تیسری سمت مدینہ کی سرحدوں پر موجود یہود سے ملتی تھی اور چوتھی مکہ کی طرف جاتی تھی۔ آخری دو سمتوں سے مسلمانوں کو خطرہ تھا۔ یہودی نبی کریم ﷺ کے مدینہ آنے کے بعد دینِ اسلام کو کھلم کھلا چیلنج نہیں کر رہے تھے کیونکہ مدینے کا بااثر طبقہ اب اسلام قبول کر چکا تھا۔ لیکن دوسری طرف کفارِ مکہ مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے۔ جس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنے سیاسی فہم کی بنا پر یہود سے معاہدہ کر کے مدینہ کو تین اطراف سے محفوظ کر دیا، تاکہ پوری توجہ کے ساتھ کفارِ مکہ کی اجارہ داری اور سیاسی ہیبت کو پارہ پارہ کیا جاسکے۔ اسی سبب سے بدر سے پہلے جو سریات وغزوات کفارِ مکہ کی جانب بھیجی گئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے قریش کے شام کی طرف سفر کرنے والے تجارتی

قافلوں کو یرغمال بنایا جو مدینہ سے گزرتے اور اس کے لیے Red Sea Coast اور مدینہ کے درمیان موجود قبائل سے معاہدے کئے گئے، جیسے بنو ضمرہ اور بنو مدلج۔ اسلام کی آمد سے قبل بھی یہودیوں کا معاشرہ مدینہ کے معاشرے سے الگ تھلگ تھا، تاہم مدینہ کی نومولود ریاست کے لیے ناگزیر تھا کہ ارد گرد کے لوگوں اور اپنے باشندوں کے درمیان تعلقات کی وضاحت کرے تاکہ ریاست طے شدہ مقاصد کو حاصل کرے اوراس میں کوئی اندرونی رکاوٹ موجود نہ ہو۔ لہٰذا میثاقِ مدینہ رقم کیا گیا۔ یہ دستاویز رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین و انصار کے درمیان تحریر فرمائی اس میں یہود کا بھی تذکرہ کیا اوران پر بھی شرائط عائد کی گئیں۔ اس دستاویز میں مسلمانوں کے مابین اور ان میں شامل ہونے والے لوگوں کے طرزِ تعلقات کی وضاحت کی گئی تھی جس کے بعد یہودیوں کے مختلف قبائل سے مسلمانوں کے تعلقات کی حد بندی کو بیان کیا گیا تھا۔ دستاویز کی شرائط کے ذریعے یہودیوں کی اسلامی ریاست میں حیثیت مقرر کی گئی ہے۔ دستاویز کی عبارت میں بڑی صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے۔ کہ یہودیوں کے مسلمانوں سے معاملات کا تعین اسلام کی بنیاد پر ہو گا اور اس بات پر کہ وہ اسلام کی اتھارٹی کے تحت ہوں گے اور وہ ہر اُس امر کی پابندی کریں گے جو اسلامی ریاست کے مفادات و مصالح کا لازمی تقاضا ہو۔ چنانچہ دستاویز کے متن کے متعدد نکات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ (۱) یہودیوں کے قریبی دوست، انہی کی طرح ہیں یہ رسولِ کریم ﷺ سے اذن لیے بنا باہر نہ جائیں گے۔ (۲) یثرب (مدینہ) اس دستاویز میں لکھے گئے لوگوں کی پناہ گاہ ہو گا۔ (۳) اس دستاویز میں شامل لوگوں کے مابین اگر کوئی ایسی بات سرزد ہو جس سے فتنہ و فساد کا ڈر ہو تو یہ معاملہ ربِ کریم ورسول اللہ ﷺ کی طرف (فیصلے کیلیے) لایا جائے گا۔ (۴) قریشِ مکہ کو یا اُن کے مددگاروں کو پناہ نہیں دی جائیگی۔

اس طرح مدینہ کے اطراف کے یہودیوں کی حیثیت کا تعین کیا گیا اور ان کو پابند کیا گیا ہے کہ یہ مدینہ چھوڑ کر نہیں جاسکتے سوائے نبی کریم ﷺ سے یعنی اسلامی ریاست سے اجازت کے ساتھ، یہ کہ وہ مدینہ کی حرمت کے پابند ہونگے یعنی وہ نہ تو مدینہ پر جنگ کر سکیں گے اور نہ کسی ایسے فریق کی مدد کرینگے جو مدینہ پر حملہ کرے، وہ نہ تو قریشِ مکہ کو اور نہ اُن کے کسی حلیف کو پناہ دینگے اور یہ کہ اُن کے کسی بھی معاملے میں اختلاف ہونے پر فیصلہ رسول ﷺ فرمائیں گے۔ یہود ساری شرائط مان گئے اوراُن کے قبائل جیسا کہ بنو عوف، بنو نجار، بنو حارث، بنو ساعدہ، بنو جشم، بنو الأوس اور بنو ثعلبہ کے یہودیوں نے اس دستاویز پر دستخط کر دیئے۔ اس دستاویز پر دستخط ثبت کرنے میں بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنو قینقاع اُس وقت شامل نہیں ہوئے تھے، لیکن کچھ عرصے بعد ان کے ساتھ بھی اسی طرح کی دستاویز طے پا گئی اور یہود نے اس دستاویز میں مذکور شرائط کو تسلیم کر لیا۔ پس ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ میثاق کسی طور بھی یہودیوں کو اسلامی ریاست کے اندر اپنی ایک الگ خود مختار اتھارٹی کی حیثیت نہیں دیتا۔ جب بھی یہود اس معاہدہ سے پھرے انہیں سنگین نتائج بھگتنا پڑے۔

تیسرے نکتے کا جائزہ: تیسرا نکتہ یہ تھا کہ فتح مکہ پر اسلام کی حکمرانی قائم اور انقلاب کی تکمیل ہوئی۔

اس غلط فہمی کا ازالہ: قریش کی معاشی قوت کو ختم کرنے اور خیبر کی فتح کے بعد اسلام حجاز پر غالب آچکا تھا اور مکہ کی کفریہ ریاست کی حیثیت صرف اتنی تھی کہ ٹوٹی ہوئی دیوار کو آخری دھکا دیا جائے۔ لہٰذا فتح مکہ کے بعد اسلامی ریاست عرب کی طاقت ور ترین ریاست بن گئی۔ اس بات سے اختلاف نہیں کہ فتح مکہ اسلام کی عظیم فتح ہے اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی تب حکومت آئی جب مکہ فتح ہوا۔ جس طرح اوپر واضح ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح مدینہ پر حکومت کیا کرتے تھے اور مدینہ کے اجتماعی تنازعات حل کرتے تھے۔ صلح حدیبیہ دو ریاستوں کے درمیان معاہدہ تھا اور دیگر کامیابیوں کے علاوہ صلح حدیبیہ کی ایک کامیابی یہ تھی کہ اس دستاویز کے نتیجے میں قریش نے رسول اللہ ﷺ کی مدینہ کی ریاست کو بھی اکائی تسلیم کر لیا۔ جہاں تک رسول اللہ ﷺ کا قریش کے مطالبے پر محمد ﷺ کے نام سے جڑے رسول اللہ کے الفاظ کو مٹانے کے متعلق جو بات ہے اس یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ مدینہ ایک ریاست نہیں تھی بلکہ قریش کا یہ مطالبہ کرنے میں یہ مان رہے تھے کہ ہم محمد ﷺ کو ایک مملکت کا حکمران مانتے ہیں(اسی لیے تو یہ معاہدہ اوس و خزرج کے سرداروں کے بجائے محمد ﷺ سے طے پا رہا ہے) مگر محمد ﷺ کو اللہ کا رسول ماننے کو تیار نہیں۔ اور محمد ﷺ یہ بھی مان گئے جس کا سبب یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ معاہدہ ہٰذا کے ذریعے قریش سے یہ تسلیم کرانے کے لیے نہیں آئے تھے کہ تم مجھے اللہ کا رسول مانو بلکہ مقاصد تو کچھ اور تھے۔ یہ کہنا کہ دین فتح مکہ کے بعد جا کر مکمل ہوا تو دین کے اتھارٹی کے طور پر قائم ہونے اور مکمل ہونے کے درمیان فرق ہے۔ ریاست کا بنیادی تصور ایک اتھارٹی ہے جو ایک نظامِ حیات پر لوگوں کو پابند کرے اور اس کی تنظیم کرے جو مدینہ میں پہلے دن سے موجود تھی۔ یہ ریاست کے بطورِ ریاست موجود ہونے کی سرے سے کوئی شرط ہی نہیں کہ وہ ریاست اپنی دشمن ریاست کو فتح کرے جیسا کہ فتح مکہ کے نتیجے میں ہوا تھا۔

فتح مکہ سے قبل اور بعد رسول اللہ ﷺ کے اعمال کی نوعیت و قرآنی آیات کی نوعیت میں ہمیں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی لیکن ہجرت سے قبل اور بعد رسول اللہ ﷺ کے اعمال و قرآنی احکامات میں واضح فرق نظر آتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مدینہ میں ریاست کا قیام ہجرت کے بعد ہوا نہ کہ فتح مکہ کے بعد۔ اسی لیے فقہاء نے حکمرانی اور اس کے احکامات اخذ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے مدنی دور میں کیے گئے اعمال کو جب بطورِ دلیل پیش کیا تو اس کی رعایت نہ رکھی کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ کام فتح مکہ سے قبل سرانجام دیا تھا یا یہ عمل فتح مکہ کے بعد سرانجام دیا تھا کیونکہ وہ فتح مکہ سے قبل اور بعد دونوں اوقات میں پہلی اسلامی ریاست کے حکمران تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مدینہ کی طرف ہجرت صرف اس لیے نہیں کی گئی تھی کہ مکہ کے کفار کے ظلموں سے چھٹکارہ ملے بلکہ اس سے بڑھ کر پوری دنیا تک دینِ اسلام کی دعوت بلا روک ٹوک پہنچانا تھا جس کے لیے ایک ریاست

اور مرکز قائم کرنے کی ضرورت تھی جو ایک آزاد و خود مختار حکومت کے قیام کے بغیر ممکن نہ تھا جس کے قیام کے بعد عملی طور پر اس کا مشاہدہ دنیا نے کیا۔

اسی لیے پہلی ہجرت کرنے والے مہاجرین کو حبشہ میں مستقل رکنے سے روکا گیا جب کہ حبشہ کا بادشاہ ان مہاجرین کو امن اور اعزاز کے ساتھ سکونت دینے پر آمادہ تھا اور اس خدمت کو اپنے لیے اعزاز اور فخر سمجھتا تھا روایات میں آتا ہے کہ بادشاہ نجاشی نے اسلام قبول کیا اور مہاجرین کے خلاف مشرکین مکہ کا احتجاج بھی رد کر دیا تھا لیکن مہاجرین تو اپنے پیارے رسول کریم ﷺ کے حکم کے پابند تھے کہ ہجرت حبشہ مستقل نہیں تھی کیونکہ ہجرت حبشہ میں نبی کریم ﷺ نے اس جانب اشارہ فرمایا تھا "**حتی یجعل اللہ لکم منہ خرجا**" بلکہ تاوقت کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے موجودہ صورت حال سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا فرمادیں گے۔ جیسے ہی مدینہ کی اسلامی ریاست قائم ہوئی تو حبشہ سے تمام مہاجرین کو دوبارہ حبشہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کرنے کو کہا۔ جس کے حکم کے رسول اللہ ﷺ منتظر تھے۔

یہ اسلامی ریاست کا آغاز وارتقاء تھا کہ اسلامی ریاست کن حالات و واقعات سے گزرتے ہوئے وقوع پذیر ہوئی۔ اور اس کے بانی نبی آخر الزمان جناب سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ تھے آپ ﷺ اور صحابہ کرام نے مل کر اسلامی ریاست اور اس کے اسلامی نظام کے ذریعے پوری دنیا میں امن قائم کیا اور ہر طرف عدل وانصاف کا بول بالا کیا۔

مذکورہ بالا بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرت مدینہ نہ محض پناہ کے حصول کے لیے تھی بلکہ اس ہجرت کے دیگر مقاصد کے ساتھ ساتھ ایک مقصد ریاست و حکومت کا قیام بھی تھا۔ اور وہ ایک ایسی ریاست و حکومت کا قیام تھا جس میں حاکمیت اعلیٰ کا حقیقی اقتدار خالقِ کائنات اللہ رب العزت کے پاس ہے اور انسانوں کو بطور خلیفہ اقتدار سونپا جاتا ہے۔ ایسی ریاست میں خالقِ کائنات کے اپنے بنائے ہوئے قوانین کا نفاذ اور اجراء ہوتا ہے، انسان اپنی مرضی سے ان قوانین میں ردوبدل نہیں کر سکتا۔

فصل سوم:

اسلامی ریاست کی نظریاتی بنیادیں

اسلامی ریاست کی نظریاتی بنیادیں:

اسلامی ریاست کی بنیاد مندرجہ ذیل اصولوں پر ہے:۔

۱۔ اللہ کی حاکمیت

۲۔ شورائیت کا نظام

۳۔ سربراہِ حکومت کا تقرر

۴۔ حاکم / خلیفہ

۵۔ اقامتِ صلٰوۃ

۶۔ زکٰوۃ کا نظام

۷۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر

۸۔ عدل وانصاف کا قیام

طوالت اور تکرار سے بچنے کے لیے یہاں صرف چند ایک کی تفصیل بیان کی ہے باقی اپنے اپنے عنوان کے تحت مقالہ میں درج ہیں۔

اللہ کی حاکمیت (حاکمیتِ اعلیٰ) :

حاکمیت اعلیٰ کی حقدار صرف اللہ تعالیٰ کی ہستی ہے، جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے اور وہی مختارِ کل ہے جیسا چاہے کر سکتا ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اسی نے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے چنیدہ بندوں کو پیغام رساں بنا کر الگ الگ وقتوں میں الگ الگ اور مخصوص قوموں اور جگہوں میں مبعوث فرمایا، جب کہ نبی کریم ﷺ کو نبیوں کا خاتم قرار دیکر دنیا میں بھیجا اور یوں قیامت تک کے لیے نبوت کا سلسلہ ختم فرمایا نیز آپ ﷺ کو عطاء کردہ شریعت کو تا قیامت کامیابی و کامرانی کا معیار مقرر فرمایا اور دائمی شریعت و قانونِ الٰہی کی صورت میں عطاء کردہ کتاب فرقانِ حمید میں اللہ رب العزت نے اپنے آخری پیغمبر جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کی اطاعت کو لازمی قرار دیا۔ اسی حوالے سے ڈاکٹر محمود احمد غازی محاضرات شریعت میں رقمطراز ہیں:

> "زمین میں اصلی حاکمیت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ یہی بنیادی حقیقت اور نظریہ ہے جس پر ایک اسلامی ریاست قائم ہوتی ہے۔ یہ بات کہ خدا کی تکوینی حاکمیت ایک حقیقت کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہے، خواہ اس کا اقرار کیا جائے یا نہ کیا جائے، اگرچہ اپنی جگہ صحیح ہے لیکن اسلام میں حاکمیت کے اقرار کو یہ لازمی شرط ہے کہ اس کی تکوینی حکومت کے ساتھ ساتھ

اس کی تشریعی حکومت کو بھی مانا جائے ۔ جس کا معنیٰ یہ بنتا ہے کہ جس جگہ اس چیز کا اقرار کیا جانا ضروری ہے کہ وہی اللہ تنہا تمام جہانوں کا مالک اور حاکم ہے جب کہ دوسرا رخ اس چیز کا بھی اقرار کیا جائے کہ تنہا اسی کے لیے یہ حق بنتا ہے کہ اپنے بندوں کو نظام زندگی تجویز کرے اور ان کے لیے قانون بنائے۔ چنانچہ اسی لیے ہمارے لیے خدا کی توحید کو ماننے کے ساتھ ساتھ اس کے رسول ﷺ کی نبوت کا اقرار لازمی ٹھہرا۔ اگر کوئیر سول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار نہیں کرتا تو پھر حاکمیت الٰہی کا اقرار بالکل بے وقعت ہو جائے گا۔ کیونکہ اس اقرار کے باوجود خدا کی توحید و حاکمیت کا منکر قرار پائے گا کیونکہ اس نے خدا کی تشریعی حاکمیت کا اقرار نہیں کیا ہے، جو حاکمیت الٰہی کے اقرار کی ایک لازمی شرط ہے۔"[1]

عام فہم انداز میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کلمہ طیبہ اسلام کی اساس ہے جس کے دو جزو ہیں، ایک **لااله الا الله** جو خدا کی تکوینی حاکمیت کا اقرار ہے، اور دوسرا **محمد رسول الله** جو خدا کی تشریعی حاکمیت کا اقرار ہے اور یہ دونوں جز لازم وملزوم ہیں۔ توحید کے ساتھ رسالت پر ایمان در حقیقت توحید ہی کا ایک لازمی تقاضا ہے۔

عقیدۂ توحید مملکتِ اسلامی یا سیاست شرعیہ کی سب سے اہم بنیاد ہے یعنی صرف اللہ تعالیٰ سارے انسانوں کا معبود حقیقی ہے انسان کو چاہیے کہ وہ اسی کے آگے سر جھکائے، اسی سے مانگے، اُسے کار ساز جانے، قرآن مجید میں عقیدۂ توحید کو مختلف انداز سے بار بار نمایاں کیا اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

﴿ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ﴾[2]

ترجمہ: وہی ایک اللہ تمہارا رب ہے نہیں اس کے علاوہ کوئی معبود، صرف وہی ہر چیز کا خالق ہے، پس بندگی اسی کی کرو اور وہ ہر شئ کا نگہبان ہے۔

عقیدۂ توحید کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان غیر اللہ کی عبدیت سے نکل کر صرف اللہ وحدہ کا غلام بن جاتا ہے؛ چنانچہ ایک مسلمان صرف خدا ہی کے احکام پر چلتا ہے اور جب وہ کسی غیر مسلم کو اسلام کی دعوت دیتا ہے تو دراصل اسے غیر اللہ کی غلامی سے ہٹا کر اللہ کی غلامی میں لاتا ہے۔

---

(۱) محاضراتِ شریعت، ڈاکٹر محمود احمد غازی، الفیصل ناشران وتاجران کتب، اردو بازار لاہور، طبع اول، ۲۰۰۹، ص ۲۸۷

(۲) سورۃ الانعام: ۶/ ۱۰۲

کلمہ کے دوسرا جزرسالت پر ایمان:

توحید کے ساتھ رسالت پر ایمان درحقیقت توحید ہی کا ایک لازمی تقاضا ہے۔اس لیے جہاں اللہ کی حاکمیت بنیادی نظریہ ہے وہیں آپ ﷺ کی رسالت پر ایمان بھی بنیادی نظریہ ہے۔اللہ رب العزت نے مخلوق کو ہدایت دینے کی خاطر جن برگزیدہ ہستیوں کے ذریعے اپنا پیغام حق مخلوق کو دیا ایسی ہستیوں کو انبیاء ورسل کا خطاب دیا گیا ہے اور ان کے مناصب کو نبوت اور رسالت کہا جاتا ہے۔

اسلامی عقائد کی رو سے ایمان بالرسالت سے مراد حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء سرور کائنات حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ گرامی تک سارے نبیوں اور رسولوں کو برحق تسلیم کرنا ہے۔کیونکہ ہر پیغمبر اپنے اپنے مقام پر اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہے جو کہ حق وسچائی کی مکمل مثال تھے تمام نے ایک ہی کام اور مقصد کی تکمیل کے لیے ایک ہی لائن پر امور سرانجام دیئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ حاکمیت اعلیٰ سے متصف ذات ہے جو اللہ کی تکوینی حیثیت کو واضح کرتی ہے جبکہ خدا کی تشریعی حاکمیت کے مظہر اس کے انبیاء ہوتے ہیں۔اسی حوالے سے ڈاکٹر محمود احمد غازی رقمطراز ہیں:

> انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے نمائندے اور سفیر کی حیثیت سے لوگوں تک پیغام رسانی کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ وہ اپنی رعایا کو کن باتوں کا حکم دیتا اور کن باتوں سے روکتا ہے اور فرد اور معاشرے کے لیے وہ کس ضابطہ حیات کو پسند کرتا ہے۔یہ انبیاء خدا کی مرضی اور اللہ کے حکموں کو پہنچانے کا بالکل محفوظ ومعصوم ذریعہ ہوتے ہیں۔خدا کے احکام پہنچانے کے معاملے میں ان سے کسی غلطی کا امکان نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ براہ راست ان کی نگرانی فرماتا ہے کہ وہ دنیا کو اس کے احکام وہدایات سے صحیح صحیح مطلع کر سکیں۔یہ انبیاء خدا کی طرف سے واجب الاطاعت ہادی کی حیثیت سے آتے ہیں۔ان کی اطاعت کیے بغیر کوئی شخص خدا کی وفادار رعیت نہیں قرار پاسکتا۔خدا کی وفاداری کے لیے یہ اہم ہوتا ہے کہ ان کی تابعداری کو اپنایا جائے اور ان کا وفادار رہا جائے۔[1]

خدا کی اطاعت کی عملی شکل درحقیقت رسول ﷺ کی اطاعت ہی ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾ [2]

---

(۱)محاضراتِ شریعت،ڈاکٹر محمود احمد غازی،ص۲۹۶

(۲)سورۃ النساء:۴/۵۹

ترجمہ: اے مومنوں فرمانبرداری کرو اللہ اور اس کے پیغمبر ﷺ کی اور ان کی جو تم میں سے اقتدار والے ہیں۔

اسی طرح ارشادِ نبوی ہے:

((قَالَ مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللَّهَ وَمَنْ أَطَاعَ أَمِيرِي فَقَدْ أَطَاعَنِي وَمَنْ عَصَى أَمِيرِي فَقَدْ عَصَانِي)) (۱)

ترجمہ: جو کوئی میرا کہا مانتا ہے گویا وہ اللہ کا کہا مانتا ہے اور جو کوئی میری نافرمانی کرتا ہے حقیقت میں اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے میرے امیر کی مانی گویا اس نے میری مانی۔

قرآنی آیت اور حدیث نبوی میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اولوالامر کی تابعداری کا بھی حکم دیا ہے نہ صرف حکم دیا گیا ہے بلکہ حدیث نبوی میں امیر کی تابعداری کو پیغمبر ﷺ کی تابعداری گردانا گیا۔

اللہ رب العزت کے کلام میں جس جگہ بھی اطیعواللہ وارد ہوا ہے ساتھ ہی اطیعوالرسول کا بھی حکم ہے اس وجہ سے خدا اور اس کے رسول میں فرق کرنا اس کی اسلام میں کسی قسم کی گنجائش نہیں ہے۔ جو انسان اللہ کی اطاعت مانتے ہیں لیکن اس کے رسول ﷺ کی اطاعت نہیں کرتے اس کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ ان کو بادشاہ کی اطاعت تو قبول ہے لیکن اس کے مقرر کیے ہوئے نائب کی اطاعت تسلیم کرنے کیلیے تیار نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی خود مختاری پوری دنیا کے قوانین میں کہیں تسلیم نہیں کی گئی تو اللہ کے قانون میں کیوں کر تسلیم کی جاسکتی ہے۔ نیز قرآنی آیت اور حدیث نبوی کا تقاضا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی نیابت کرنے والے اولوالامر کی بھی تابعداری کی جائے۔

اولوالامر کی حیثیت:

اللہ کے رسول ﷺ کی رحلت فرمانے کے بعد یہ ذمہ داری امت کے اولوالامر یعنی ارباب حل و عقد کی طرف منتقل ہوئی۔ وہ اس بات کے لیے مسؤل قرار پائے کہ وہ خدا کی زمین میں خدا کے احکام و قوانین نافذ کریں۔ خود بھی ان کی اطاعت کریں اور دوسروں سے بھی ان کی اطاعت کرائیں۔ یہ اولوالامر درحقیقت اللہ کے رسول ﷺ کے خلفاء ہیں اس حیثیت سے اولوالامر کی اطاعت واجب ہے۔ سورۃ النساء میں اسی کا درس دیا گیا ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل، دار طوق النجاۃ، ط، اولیٰ، کتاب الاحکام، بَاب قَوْلِ اللَّهِ تَعَالَىٰ {أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ} حدیث نمبر، ۷۱۳۷، ۱۸/۴۴

فصل چہارم:

اسلامی ریاست کی خصوصیات

اسلامی ریاست کی خصوصیات:

قرآن مجید وسیرت نبوی کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست چند بنیادی اصولوں پر قائم ہوتی ہے۔ مدینہ منورہ میں رسول کریم ﷺ کی قائم کردہ پہلی اسلامی ریاست کی تشکیل میں بھی یہی بنیادی اصول بدرجہ اتم کارفرما تھے، اسی طرح دورِ حاضر میں بھی انہی بنیادی اصولوں پر اسلامی ریاست تشکیل پاسکتی ہے۔ جو ریاست ان بنیادی اصولوں کے مطابق تشکیل پائے گی حقیقت میں وہی ریاست، اسلامی ریاست کہلانے کی حقدار ہو گی۔ ان خصوصیات کے بغیر اسلامی ریاست کا تصور ممکن نہیں۔

ظہور اسلام کے بعد مدینہ کو پہلی ریاست کا درجہ حاصل ہوا۔ اسلامی ریاست جن بنیادی اصولوں پر قائم ہوئی وہ مندرجہ ذیل ہے :

ا۔ اسلامی ریاست کی بنیادی خصوصیت:

اسلام کی آمد مکہ میں ہوئی مگر مسلمانوں نے ہجرت کر کے مدینہ منورہ کو محفوظ جائے پناہ بنالیا، اور اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی گئی اور مدینہ کے ارد گرد کے قبائل کے ساتھ دفاع کے حوالے سے باقاعدہ ایک معاہدہ طے پایا۔

جیسا کہ تاریخ طبری میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ مدینہ جیسے پہنچے یہودیوں سے معاہدہ کرلیا، جس سے یہودیوں کی مذہبی آزادی، مال ومتاع اور حقوق کی نگہداشت کی ذمہ داری اٹھائی گئی۔ معاہدہ میں یہ شرط قرار پائی تھی کہ اگر کسی فریق پر حملہ کیا جائے تو دوسرے فریق کو اس کی مدد کے لیے آنا ہو گا۔ (۱)

ریاستِ اسلامی کی بنیاد جن بنیادی اصولوں پر قائم کی گئی تھی ان میں سب سے بنیادی اصل یہ تھا کہ حاکمیت اعلیٰ / مقتدر اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اس کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ اس دنیا پر اللہ رب العزت ہی حاکمیت اصل ہے۔ یہ اسلامی ریاست کی وہ بنیادی اکائی ہے جسے قرآن مجید نے کئی مقامات پر واضح طور بیان کیا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (۲)

ترجمہ: فرماں روائی صرف رب تعالیٰ کی ہے، اس کا فرمان ہے کہ تم سب سوائے اس کے کسی اور کی بندگی نہ کرو یہی دین درست ہے لیکن زیادہ لوگوں کو اس کا علم نہیں۔

---

(۱) تاریخ طبری، ابن جریر طبری (مترجم، سید محمد ابراہیم ایم۔ اے ندوی): دارالاشاعت کراچی، ۲۰۰۳ء، ۲/ ۱۹۳

(۲) سورۃ یوسف: ۱۲/ ۴۰

﴿أَلَا لَهُ الْحُكْمُ﴾ (۱)

ترجمہ: یادرکھو! حاکمیت صرف اسی کیے لیے ہے۔

﴿أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ﴾ (۲)

ترجمہ: یادرکھو! خالق بھی وہی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے

﴿وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۳)۔

اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ ہی کے لیے ہے۔

﴿قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ﴾ (٤)

ترجمہ: کہو کہ یا اللہ! اے سلطنت کے بادشاہ تو جسے چاہے سلطنت دے۔

﴿أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ﴾ (۵)

ترجمہ: کیا پھر جاہلیت کے فیصلہ چاہتے ہیں ؟اور جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ کے حکم سے بہتر کسی کا حکم نہیں ہے۔

آیتِ مبارکہ واضح کرتی ہے کہ لوگوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلے دینا جہالت کہلائے گی۔ ایمان ویقین کا تقاضہ ہے کہ شرعی قانون کو بہترین ماننا۔

﴿أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا﴾ (٦)

ترجمہ: تو پھر کیا میں اللہ کے علاوہ کوئی اور حاکم ڈھونڈوں حالانکہ اسی نے تم پر واضح کتاب اتاری ہے۔

یعنی ان لوگوں پر بڑا تعجب ہے جو اللہ کے واضح قانون کے ہوتے ہوئے انسانوں کے بنائے ہوئے کی تلاش کرتے ہیں۔

﴿وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ﴾ (۷)

---

(۱) سورۃ الانعام: ٦/ ٦٢

(۲) سورۃ الاعراف: ۷/ ۵۴

(۳) سورۃ آل عمران: ۳/ ۱۸۹

(۴) سورۃ آل عمران: ۳/ ۲٦

(۵) سورۃ المائدۃ: ۵/ ۵۰

(٦) سورۃ الانعام: ٦/ ۱۱۴

(۷) سورۃ البقرۃ: ۲/ ۲۱۳

ترجمہ: اور نازل کی ساتھ ان کے حق کے ساتھ کتاب جس سے وہ عوام الناس کے درمیان ان کے مختلف فیہ میں فیصلہ کریں۔

﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ (۱)

ترجمہ: اور جو کوئی اللہ کے نازل کیے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں، پس وہ لوگ کافر ہیں۔

﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (۲)

ترجمہ: اور جو کوئی اللہ کے نازل کیے ہوئے حکم کے موافق حکم نہ کرے، پس وہ ظالم ہیں۔

﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ (۳)

ترجمہ: اور جو کوئی اللہ کے نازل کیے ہوئے حکم کے موافق حکم نہ کرے، پس وہ فاسق ہیں۔

مذکورہ بالا تمام آیات قرآنیہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے حاکمیت اعلیٰ پر دال ہیں۔ اگر حاکمیت کا دارومدار انسانی عقل پر ہوتا تو نہ پھر انبیاء علیہم السلام کو بھیجنے کی ضرورت تھی نہ کتابیں نازل کرنے کی حاجت تھی کتابیں نازل اس لیے کی گئی ہیں کہ لوگوں کے معاملات، مسائل اور اختلافات کا فیصلہ ان کتابوں کے مطابق کیا جائے اور انسانوں کی زندگیوں کے لیے واجب الاطاعت قانون بنایا جائے۔

اسلامی ریاست میں حاکمیت و اقتدار اعلیٰ کا منصب اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے۔ حاکمیت الہٰ یہی وہ بنیادی اصول ہے جس نے اسلامی ریاست کو دوسری ریاستوں سے انفرادیت عطا کی اور اس کے نظم ونسق کو ایک خاص نہج پر استوار کیا۔

۲۔ خارجی اور داخلی معاہدے کی پابندی:

یہ اسلامی ریاست کی ایک بہت ہی اہم اور ضروری خصوصیت ہے تاکہ امن وامان باقی رہے۔ اس ضمن میں ارشادِ گرامی ہے:

﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ﴾ (۴)

---

(۱) سورۃ المائدۃ:۵/۴۴

(۲) سورۃ المائدۃ: ۵/۴۵

(۳) سورۃ المائدۃ: ۵/۴۷

(۴) سورۃ النحل: ۱۶/۹۱

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم آپس میں قول و قرار کرو اور قسموں کو ان کی پختگی کے بعد مت توڑو، حالانکہ تم اللہ تعالیٰ کو اپنا ضامن ٹھہرا چکے ہو تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کو بخوبی جانتا ہے۔

عہد کی پابندی فرض ہے اور اسی کے مطابق زندگی گزارنی ہے اور اس کی مخالفت کرنا جائز نہیں۔اسی حوالے سے اللہ تعالیٰ دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾[1]

ترجمہ : عہد کی پابندی کرو، بیشک عہد کے بارے میں تم سے جواب دہی ہو گی۔

مذکورہ بالا آیات میں عہدوں کو پورا کرنے کی تلقین کی گئی ہے اب چاہے یہ معاہدہ کسی کے بھی ساتھ ہو اس کو پورا کرنا ضروری ہے اور یہ کہ چاہے وہ معاہدہ بیرونی دنیا کے ساتھ ہو یا اندرونی طور پر ملک کی رعایا کے ساتھ ہو چاہے مسلم رعایا کے ساتھ ہو یا غیر مسلم رعایا کے ساتھ ہو۔

اسی لیے دیکھا جائے تو اسلامی ملک کی رعایا میں مسلم اور ذمی کے حقوق میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا ہے اس کے متعلق ارشادِ نبوی ہے:

((إن الله جعل السلام تحية لأمتنا وأمانا لأهل ذمتنا))

ترجمہ:اللہ تعالیٰ نے اسلام کو امتِ محمدیہ کے لیے مبارک بادی کا اور ذمیوں کے لیے امان کا ذریعہ بنایا ہے۔

خارجی معاملات میں اسلامی ریاست امن کی دعوت دیتی ہے بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی حرمات کی پامالی نہ ہو یا مسلمانوں کے ملک پر حملہ نہ کیا جائے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾[2]

ترجمہ:وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنہوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہیں نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے، ان سے جو لوگ دوستی کرے وہی ظالم ہے۔

---

(۱)سورۃ الاسراء: ۱۷/ ۳۴

(۲)سورۃ الممتحنہ: ۶۰/ ۸-۹

۳۔ شورائی نظام:

اسلامی ریاست کی اہم انفرادیت وخصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک شورائی نظام کی حامل ریاست ہے،اس میں مساوات ہیں، حسب ونسب،قوم و ملت کی وجہ سے کوئی ، کسی پر برتر نہیں ہے ۔وحدت اور مساوات وحریت کے بنیادی اصول ہیں۔اربابِ اختیار تمام امور سلطنت باہم مشاورت سے طے کرتے ہیں۔اور نظام حکومت کو جمہور کی مرضی سے چلاتے ہیں۔ ساری رعایا کی بنیادی ڈیوٹیاں و فرائض اور حقوق مقرر ہیں جو کہ حاکمِ وقت قانون شریعت کے مطابق اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کا پابند ہے اور رعایا سے ان کی ذمہ داریاں پوری کروانے کا پابند ہے۔اسلامی حکومت کا مزاج نہ آمرانہ ہے اور نہ ہی بادشاہت والا مزاج ہے بلکہ اس کا میلان خاص جمہوریت اور شورائیت کی طرف ہے۔

شوریٰ یا شورائیت سے مراد ہے کہ کوئی معاملہ جس کے متعلق شریعت میں کوئی واضح حکم نہ ہو اس سے متعلق ماہرین کی آراء لینااور قرآن وسنت کی روشنی میں ان آراء میں سے بہتر اور مفید رائے پر قوتِ دلیل کے اعتبار سے اور اللہ تعالیٰ پر توکل اوراعتبار کرتے ہوئے فیصلہ اور عمل درآمد کرنا ہے۔

مشاورت کو اسلامی نظام حکومت میں بڑی اہمیت دی گئی ہے جس اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے اللہ رب العزت نے قرآن کریم کی مکمل سورۃ کو الشوریٰ کے نام سے موسوم کیاہے۔اسلامی ریاست میں شورائی نظام کا ایک خاص مقام ہے یہی وجہ تھی کہ ربّ العالمین نے اپنی کتاب میں بھی مسلمانوں کے معاملات کی تعریف درج ذیل الفاظ میں کی ہے:

﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾ (۱)

ترجمہ:اوران کے امور آپس کے مشورے سے ہوتے ہیں۔

شوریٰ اسلامی ریاست کا بنیادی اصول ہے جس کی طرف مسلمانوں کی راہنمائی کی غرض سے ربِ کائنات نے پیارے نبی ﷺ سے فرمایا:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ (۲)

ترجمہ: باہمی معاملات میں مشاورت سے کام لو۔

---

(۱)سورۃ الشوریٰ:۴۲/۳۸

(۲)سورۃ العمران: ۳/۱۵۹

مذکورہ بالا آیات ظاہر کرتی ہیں کہ شوریٰ ایمان والوں کے خصائص میں سے ہے جس سے انہیں مزین ہونا چاہیے۔اہلِ شوریٰ اور سربراہِ مملکت کا ان صفات سے مزین ہونامعاشرے میں ان کو مقبول ومعتمد بنا دیتاہے کیونکہ اسلامی ریاست کے سربراہ کے لیے اکثریت کے اعتماد کا حامل ہونا ضروری ہے۔

سیدنا ابوہریرہ فرماتے ہیں:

((مارأیت احدا قط کان اکثر مشورۃ لاصحابہ من رسولﷺ))[1]

ترجمہ:میں نے کسی کو بھی نہیں دیکھا اصحاب رسول اللہ سے مشاورت میں بڑھ کر۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

"تم میں نیک اور صالح ہوں،تمہارے اہلِ ثروت تم میں فیاض ہوں،تمہارے اموربا ہمی مشاورت سے طے پائیں۔"

۴۔ حقیقی فلاحی مملکت:

اسلامی ریاست کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک حقیقی فلاحی اور خادم ریاست ہے۔اسلام کی نظر میں حکومت کاکام صرف یہ نہیں ہے کہ امن وامان قائم کرے اور ملکی دفاع کی خدمات انجام دے،بلکہ اس کے فرائض میں شامل ہے کہ حیات کے ہر شعبے میں حقیقی اور فطری مساوات قائم کرے،ان تمام رکاوٹوں کو دور کرے جو سعی و جہد اور مساوات کی راہ میں حائل ہیں اور اپنے تمام شہریوں کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کی ضمانت دے۔

معاشی زندگی کے متعلق دینِ اسلام یہ ہدایت دیتاہے کہ اسلامی معاشرے وحکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ افلاس اور غربت مٹانے کو ہر وقت سرگرم رہیں۔اسلام ہر فرد میں معاشی جدوجہد کا جذبہ پیدا کرتاہے اور اسے دعوت دیتاہے کہ اپنی محنت سے روزی حاصل کرے۔

انسان کی محنت سے حاصل کردہ دولت کو اپنی ضروریات تک محدود رکھنے کی بجائے اسلام اسے دوسرے ضرورت مندوں تک پہنچانے کا درس بھی دیتاہے۔زکوٰۃ،عشر اور دیگر ٹیکسز کی مد میں مستحقین کو ان کا حق پہنچانے کی تلقین بھی اسلام نے کی ہے اور یہ تصور مہیا کیا گیاہے ہر شخص اپنی دولت میں اپنے حق کے علاوہ خدااور اس کے بندوں کا حق بھی مدّ نظر رکھے۔ضروری ہے کہ ہر شخص اپنی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ ساتھ ریاست اور دیگر انسانوں کے حقوق بھی ادا کرے اور اپنے وسائل کو ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے صرف کرے جو دولت جمع کرتے ہیں اور انسانی بہبود کے لیے اسے خرچ نہیں کرتے،یااس میں دوسروں کے حقوق نہیں نکالتے،ان کے لیے سخت وعید ہے۔ہر صاحبِ نصاب پر زکوٰۃ فرض کی گئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ:

---

(۱) صحیح ابن حبان،ابو حاتم محمد بن حبان،موسسۃ الرسالۃ،بیروت،۱۹۹۳ء،۲۱۷/۱۱

((تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلَىٰ فُقَرَائِهِم))[1]

ترجمہ: ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور انہی کے غریبوں میں تقسیم کر دی جائے گی۔

زکوۃ کو محض خیرات نہیں بلکہ حق قرار دیا گیا:

﴿وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾ [2]

ترجمہ: مانگنے والوں اور محروموں کے لیے ان کے مالوں میں حق ہے۔

یہ حق حکومت کو وصول کرنا ہے اور مستحقین تک پہنچانا ہے۔

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً﴾ [3]

ترجمہ: اے نبی! ان کے مالوں سے صدقہ وصول کیجئے۔

ان تمام افراد کی کفالت کا بندوبست کرنا اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے جو مجبور، اپاہج، لاچار یا رزق سے محروم کئے گئے ہوں۔ ارشادِ نبوی ہے:

((وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ إِنْ عَلَى الأَرْضِ مِنْ مُؤْمِنٍ إِلاَّ أَنَا أَوْلَى النَّاسِ بِهِ فَأَيُّكُمْ مَا تَرَكَ دَيْنًا أَوْ ضَيَاعًا فَأَنَا مَوْلاَهُ))[4]

ترجمہ: قسم ہے اس کی کہ جس کے قبضہ قدرت میں (مجھ) محمد ﷺ کی زندگی ہے، روئے زمین پر موجود ہر مومن کے لیے میں سب سے زیادہ قریب ہوں پس جو شخص قرض چھوڑ جائے تو میں اس کا ولی ہوں۔

ان تمام آیات واحادیث کو مد نظر رکھتے ہوئے علامہ ابن قیم علماء کا یہ اصول بیان کرتے ہیں کہ:

"حکومت جس طرح وارث بنتی ہے لاوارث کی، اسی طرح وہ مقروض کا قرض ادا کرنے کی بھی ذمہ دار ہے جبکہ وہ قرض کی ادائیگی کے لیے بغیر کوئی چیز چھوڑے مر جائے۔ نیز وہ اس کی زندگی میں کفالت کی بھی ذمہ دار ہو گی جبکہ کوئی اس کی کفالت کرنے والا نہ ہو۔"[5]

علامہ ابن حزم یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ:

---

(۱) صحیح بخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل، بخاری، کتاب الزکاۃ، باب فی وجوب الزکاۃ، حدیث نمبر، ۱۳۹۵، ۳/۳۹۹

(۲) سورۃ الذاریات: ۱۹/۵۱

(۳) سورۃ التوبۃ: ۱۰۳/۹

(۴) صحیح مسلم، مسلم بن حجاج، کتاب الفرائض، باب من ترک مالا فلقورثتہ، حدیث نمبر، ۴۲۴۴، ۵/۴۹۲

(۵) زاد المعاد، ابن قیم، ۵۷/۱

"ہر قریہ کے اربابِ دولت کے فرائض میں شامل ہے فقراءوغرباء کی کفالت کریں اگر ملکی خزانہ کے خزانے میں سے غرباء کی معاشی ضرورتیں پوری نہ ہوں توحاکم ان اربابِ دولت کوغرباء کی کفالت کے لیے مجبور کرسکتا ہے۔کہ دولت مند ان کی معاشی ضرورت پوری کرنے کے لیے اتنا انتظام لازمی کریں جس سے ان کی بنیادی ضروریات حاجات پوری ہو سکیں،پہننے کے لیے گرم وسرد دونوں لحاظ سے لباس فراہم ہو اور رہنے کے لیے ایک ایسا مسکن ہوجوان کو بارش،دھوپ اور سیلاب جیسے حوادثات سے محفوظ رکھ سکے۔"(۱)

یہ نظام اپنی معیاری شکل میں مسلمانوں نے قائم کیااور یہ چیز اسلامی ریاست کی اہم خصوصیت کو متعین کرتی ہے۔

اسلامی ریاست دنیا کی دیگر ریاستوں سے بڑی مختلف ہے۔سرمایہ دارانہ نظام عوام کی کفالت کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔معاشی دوڑ میں جو پیچھے رہ جائے اس کے لیے کوئی سہارا نہیں۔سعی وجہد اور مواقع کی مساوات بھی اس نظام میں معدوم ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ امیر کے امیر تر ہونے کے امکانات تو ہر طرف موجود ہیں لیکن غریب کے لیے غربت کے چکر سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔اس نظام میں ظلم اور استحصال کے نت نئے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں اور بغیر منصوبہ بندی معاشی دوڑ پوری سوسائٹی کو عدمِ استحکام اورافراط و تفریط کے چکر میں گرفتار کردیتی ہے۔اسلامی ریاست منصفانہ معاشی اصولوں پر عمل کرتی ہے اور وہ سب کو مساوی مواقع دینے کے ساتھ ساتھ ہمہ گیر پیمانے پر ضرورتوں کو تھامنے کاکام بھی انجام دیتی ہے۔

اسلامی ریاست جدید طرز کی ایک مخلوط اور فلاحی ریاست سے بھی قدرے مختلف ہے کہ اسلامی ریاست میں سماجی خدمات اور بنیادی کفالت ایک حق کے طور پر کی جاتی ہے،محض سیاسی احتجاج کے سدباب کے لیے نہیں۔یہاں اس کا حصول مطالبات اور احتجاجات پر منحصر نہیں بلکہ یہ ایک بنیادی اصول ہے جسے ہر قیمت پر اور ہر حال میں اسلامی نظام پورا کرتاہے۔یہ سارا جبری طور پر نہیں کروایا جاتا بلکہ دلی تعاون اور جذبہ عبادت کے ساتھ ہوتاہے کہ ایسے کرنے سے اللہ کے ہاں اجر و ثواب کے حصول کی امید ہوتی ہے۔اسلامی نظام میں نہ صرف معیار زندگی کو بلند کیا جاتاہے بلکہ معیار اخلاق کو بھی بلند کیاجاتاہے۔یہ ایک انقلابی تصور ہے جو موجودہ دور کے تمام معاشی تصورات سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور بہتر ہے اور اخلاقی و دنیاوی دونوں اعتبار سے بلند وبالا ہے۔

۵۔ ریاست کامعلمانہ اور داعیانہ کردار:

اسلامی ریاست کے ذمہ محض معاشی کفالت ہی کی ذمہ داریاں نہیں ہیں بلکہ اخلاقی تعلیم اور تہذیب وتمدن کی ترویج بھی اس کے ذمے ہے۔ارشاد نبوی ہے ((انما بعثت معلما) کہ میں معلم بناکر بھیجا گیاہوں۔یہ وہ ریاست

(۱)المحلی،ابن حزم،ص:۱۵۷

ہے جو رسول اللہ ﷺ کی نیابت کرتی ہے، تمام شہریو کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرتی ہے اور پوری دنیا کے لیے حق کی گواہ اور اسلام کی علمبردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ:

((طَلَب العِلمِ فَرِيضَة علىٰ كُلِّ مسلم))[1]

ترجمہ: علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔

یعنی آپ ﷺ نے علم کے حصول کو مسلمانوں کے لیے لازمی قرار دیا ہے یہاں تک فرمایا ہے کہ علم حاصل کرنا ہر مرد و عورت پر فرض ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اس فریضے کی بجاآوری کو ہر ممکن سہولت دی۔ جس سے حصول علم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ بدر کے پڑھے لکھے قیدیوں کے لیے مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کو ان کا فدیہ قرار دیا۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ ﷺ نے دوسری اقوام کی زبانیں سیکھنے کا اہتمام کیا تاکہ بین الاقوامی معاملات کے سلسلے میں وہ حکومت کو اپنی خدمات سے فائدہ پہنچا سکیں۔ فروغ تعلیم بالغاں کے لیے وقتاً فوقتاً آپ ﷺ مختلف مقامات پر باقاعدہ وفود بھیجا کرتے تھے۔ مسجد نبوی کے باہر موجود چبوترہ (صفہ) کو اسلام کا پہلا مدرسہ ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہاں سے تربیت دے کر دیگر مختلف ممالک میں فروغِ تعلیم کے سلسلے میں بھیجا جاتا تھا۔ باہر سے آنے والے لوگوں میں سے ذہین اور باصلاحیت لوگوں کو ان کی قوم کی تعلیم پر مقرر فرماتے۔ سرکاری عہدیداروں کو بھی تعلیم پھیلانے کی ہدایت کرتے۔ مثلاً نبی کریم ﷺ نے جب عمر ابن حزم کو قاضیِ یمن بنایا سب سے پہلے یہ ہدایت کی:

> "کہ وہ حق پر رہیں جیسا کہ اللہ ربّ العزت نے فرمایا ہے، لوگوں کو بھلائی کی خوشخبری اور حکم دیں، لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں، سمجھ بوجھ دیں، لوگوں کو ناپاکی کی حالت میں قرآن کو ہاتھ لگانے سے روکیں اور لوگوں کی دل داری کریں یہاں تک کہ لوگ دین کا فہم حاصل کرنے کی جانب مائل ہو جائیں۔"[2]

اسلامی تاریخ میں تعلیم کی اہمیت اور قدر و قیمت کو بڑھانے کے لیے سوسائٹی کے ہر شعبے میں شرف و اعزاز کا معیار تعلیم کو قرار دیا گیا نیز مسجد کی امامت سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں تک کے تقرر میں جس چیز کو فوقیت دی جاتی رہی وہ قرآن و حدیث کا علم ہے۔ پوری اسلامی مملکت میں اس کام کے لیے بے شمار افراد کو مقرر کر دیا

---

(۱) سنن ابن ماجہ، ابو عبد اللہ محمد بن یزید قزوینی، دار الفکر، بیروت، باب باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، حدیث نمبر ۲۲۴، ۱/۸۱

(۲) سیرۃ النبی، ابن ہشام، (مترجم مولوی قطب الدین احمد صاحب محمودی)، اسلامی کتب خانہ، اردو بازار لاہور، ۳/۲۴۱

گیا تھا کہ لوگوں میں پھیل جائیں اور ان کی تعلیم کا کام انجام دیں اور یہ اسی تعلیم کا فیض تھا کہ ایک طرف دین کا عَلَم شہر شہر، بستی بستی، محلہ محلہ اور گوشے گوشے میں پہنچا اور دوسری طرف اسلامی ریاست کو ہر موقع پر ایسے باصلاحیت اور سمجھ دار کارکن میسر آتے گئے جو زندگی کے ہر شعبے کی قیادت کر سکیں۔

اسلامی ریاست ایک معلم کی مانند ہے جو بلا تفریق و تمیز اپنے تمام شہریوں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست بھی کرتی ہے اور دنیا کے سامنے دعوتِ اسلام بھی پیش کرتی ہے۔ اس طرح اسلامی ریاست ایک طرف لوگوں کے معیارِ علم و اخلاق کو بلند کرتی ہے اور دوسری طرف ایک عالمگیر پیغام کی داعی ہے۔ یہ تربیت کسی تنگ نکتہ نظر سے وابستہ نہیں بلکہ اس کی دعوت تمام لوگوں کے لیے ہے۔ اس پہلو سے اسلامی ریاست دیگر ریاستوں سے بالکل منفرد ہے۔

مختصر یہ کہ اسلامی ریاست کا نظام حکمرانی اور اسلامی ریاست کے ادارے اور ان اداروں کے سربراہوں کے لیے اسلام نے کئی اصول وضع کئے۔ اسلام ایک مکمل ضابطہء حیات ہے اسلام میں مدینہ کی ریاست وہ ریاست ہے جس کے حکمران جنابِ محمدِ مصطفٰی ﷺ تھے۔ اسلامی ریاست میں سب کو یکساں سزا و جزا کے عمل سے گزارا گیا۔

ریاست کیا ہے اور ریاست کیسی ہونی چاہیے ؟ اس کی مختصر وضاحت یہ ہے کہ اسلام نے ریاست کا ویژن دیا، بادشاہت اور مورو ثیت کا خاتمہ کیا۔ حضور اکرم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلفیہ بنائے گئے جو مدینہ کی بجائے مکہ سے تعلق رکھتے تھے، قبیلائی طاقت پر ان کا چناؤ عمل میں نہیں لایا گیا۔ خلیفہ اول کا دور فتنوں کو ختم کرتے کرتے ہی گزر گیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ریاست کے ستونوں کو مزید پختہ کیا۔ کئی محکموں کی بنیاد رکھی، کئی ملک فتح کیے ، جنگیں لڑیں، ان کے دور میں زکوٰۃ وصول کرنے والا بھی کوئی نہیں رہا۔ اگر دیکھا جائے تو ہمارے آقائے کریم ﷺ نے ریاست کی بنیاد رکھی جسے عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بامِ عروج پر پہنچایا۔ آج بھی دنیا ان کی ریاست کے لیے اصلاحات کی معترف ہے جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ آج بھی یورپ نے خود پر عمر لاء کا نفاذ کیا ہوا ہے۔

اسلام نے شہریوں کو سب سے پہلے تحفظ فراہم کیا۔ حضرت محمد ﷺ نے بھی مدینہ کے قبائل سے پہلا معاہدہ بھی اسی حوالے سے کیا۔ یوں بادشاہی نظام یا مورثیت ختم کی۔ خلفائے راشدین کا کوئی بھی بیٹا، بھتیجا خلفیہ نہیں بنایا گیا بلکہ تقویٰ اور پرہیز گاری کی بنیاد پر شوریٰ نے انتخاب کیا۔

اگرچہ اسلام نے ریاست کا ایک بہترین فلسفہ فراہم کیا مگر اسلامی ریاست خلفائے راشدین کے دور میں ہی فتنوں کا شکار ہو گئی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد تمام خلفاء کو شہید کیا گیا۔ جنگ جمل میں ہزاروں مسلمان

آپس میں لڑ کر شہید ہوگئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد خلافت کی جگہ موروثیت نے لے لی ۔ اموی اور عباسی خاندانوں نے بادشاہت کو خلافت کا نام دیکر مسلمانوں پر حکومت کی اور آخر میں سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کیساتھ ہی برائے نام خلافت بھی اختتام پذیر ہوئی۔

باب دوم

جمہوری ریاست کا تعارف، آغاز وارتقاء، تشکیل اور نظریات

فصل اول: جمہوری ریاست کا تعارف

فصل دوم: جمہوری ریاست کا آغاز وارتقاء

فصل سوم: جمہوری ریاست کی عملی تشکیل

فصل چہارم: جمہوری ریاست کے بنیادی نظریات

فصل اول:

جمہوری ریاست کا تعارف

جمہوری ریاست کا تعارف:

جمہوری ریاست کیا ہوتی ہے سمجھنے سے پہلے جمہوریت کا معنیٰ و مفہوم جاننا ضروری ہے۔اسی سلسلے میں جمہوریت کا لغوی واصطلاحی مفہوم ذکر کرتے ہوئے اس فصل میں جمہوری ریاست کا تعارف بیان کیا جارہا ہے۔

جمہوریت کا لغوی معنیٰ:

جمہوریت بنیادی طور پر یونانی زبان سے لیا گیا ہے۔اور یہ دور وہ ہے جس دور میں ارسطو، افلاطون اور سقراط کا بول بالا تھا۔چنانچہ ان لوگوں نے جمہوریت کی لغوی معنیٰ "لوگوں کی حکمرانی Rule of the people " یہ اصطلاح دو یونانی الفاظ Demo یعنی "لوگ" اور Kratos یعنی "حکومت" سے مل کر بنا ہے۔

جمہوریت کا لفظ در حقیقت انگریزی لفظ[1] "democracy" کا ترجمہ ہے اور انگریزی میں یہ لفظ یونانی زبان سے منتقل ہو کر آیا ہے یونانی زبان میں "demo" کا مطلب عوام ہے اور "cracy" کا مطلب حکومت ہے۔[2]

عربی میں اس کا ترجمہ دیمقراطیہ کیا گیا ہے ۔

جمہوریت کی اصطلاحی تعریف:

جمہوریت کی اصطلاحی تعریف بایں الفاظ کی گئی ہے: حکومت کی ایک ایسی حالت جس میں عوام کا منتخب شدہ نمائندہ حکومت چلانے کا اہل ہوتا ہے"۔ ماہرین نے جمہوریت کی مختلف تعریفیں بیان فرمائی ہیں چیدہ چیدہ ذیل میں بیان کی جارہی ہیں۔

یونانی مفکر ہیروڈوٹس نے جمہوریت کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے کہ: "جمہوریت ایک ایسی حکومت ہوتی ہے جس میں ریاست کے حاکمانہ اختیارات قانونی طور پر پورے معاشرے کو حاصل ہوتے ہیں"۔

سابق امریکی صدر ابراہم کا قول ہے "Governament of the people,by the people for" یعنی عوام کی حاکمیت، عوام کے ذریعہ اور عوام پر۔

سیلے seeley نے جمہوریت کی تعریف کچھ یوں کی ہے:

"جمہوریت ایک ایسی طرز حکومت ہے جو سب کو شامل کرتی ہے حکومت میں"

لارڈ برائس کا خیال ہے کہ:

---

(۱)William Little H.W Fowler J. Coulson, the shorter Oxford English Dictionary The Calrendon press London , p.205،1965

(۲)The Oxford English Dictionary,James Murray, Oxford university press ,1 february 1884, United Kingdom , p .375

"جمہوریت وہ طرز حکومت ہے جس میں اختیارات ایک فرد واحد یا افراد کے ایک مخصوص طبقہ یا طبقات کی بجائے معاشرے کے تمام افراد کو بحیثیت مجموعی حاصل ہوتا ہے"

ابراہیم لنکن نے جمہوریت کی تعریف یوں کی ہے:

"جمہوریت عوام کی حکومت عوام کے ذریعے اور عوام کی خاطر"

جمہوریت کی اقسام:

جمہوریت کی دو اقسام ہوتی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔[1]

۱۔ بلاواسطہ یا براہ راست جمہوریت

۲۔ بلواسطہ یا نمائندہ جمہوریت

Direct democracy بلاواسطہ جمہوریت:

بلاواسطہ جمہوریت سے مراد وہ طریقہ کار ہے جس میں عوام براہ راست حکومتی امور میں حصہ لیتے ہیں۔ عوام خود ہی قانون وضع کرتے ہیں اور انتظامی امور انجام دیتے ہیں۔ براہ راست جمہوریت کا یہ طریقہ قدیم یونان میں رائج تھا۔ یونان کے شہر بلند و بالا پہاڑوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے الگ تھلگ تھے جن کو شہری ریاست بھی کہا جاتا تھا۔ شہری ریاست رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے بہت مختصر ہوتی تھی۔ تمام افراد ایک جگہ جمع ہو کر اپنی ضروریات کے مطابق قانون وضع کرتے اور انتظامی امور انجام دیتے تھے۔ اس طرح وہ قدیم یونان کی شہری حکومت کے امور میں براہ راست حصہ لیتے تھے۔ اس لیے اس طریقہ کار کو براہ راست جمہوریت کہا جاتا ہے۔ اب قومی ریاستوں کا براہ راست جمہوریت پر عمل کرنا کافی مشکل ہے کیوں کہ آبادی میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔

Indirect democracy بالواسطہ جمہوریت

بالواسطہ جمہوریت سے مراد وہ طریقہ ہے جس میں تمام شہری براہ راست حکومت کے امور انجام نہیں دیتے بلکہ وہ اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں جو عوام کی جانب سے ان کی منشاء کے مطابق نظامِ مملکت چلاتے ہیں۔ موجودہ دور میں قومی ریاستوں کا رقبہ بہت وسیع اور آبادی بہت زیادہ ہے۔ اور ریاست کے تمام شہری ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اور نہ ہی وہ قانون وضع کر سکتے ہیں اور نہ کاروبارِ حکومت میں حصہ لے سکتے ہیں۔ اس لیے عوام انتخابات کے ذریعے اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں جو اپنے رائے دہندگان کی جانب سے کاروبارِ حکومت چلاتے ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں نمائندہ جمہوریت بھی کہتے ہیں۔ دراصل دورِ جدید میں فلاحی ریاست کے فرائض میں بے پناہ اضافہ ہو

---

(۱) جمہوریت کیا ہے، وجاہت مسعود، ناشر، بلیو ویز، اسلامیہ کلب بلڈنگ خیبر بازار، پشاور، ص:۸

چکا ہے اور انسانی زندگی بے حد مصروف ہو گئی ہے۔ معاشی جدوجہد کی وجہ سے عام شہریوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ حکومتی فرائض بھی انجام دے سکیں۔ اس لیے وہ اپنے نمائندوں کو منتخب کر کے نظامِ حکومت چلانے کا اختیار دے دیتے ہیں اور ان کے بنائے ہوئے قوانین اور فیصلوں کا احترام اور پابندی کرتے ہیں۔

ریاست کے وہ افراد جو سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں انتخابات میں حصہ لیتے ہیں۔ عوام کی اکثریت کی تائید سے منتخب ہو کر پارلیمنٹ کے رکن بن جاتے ہیں۔ اگر ریاست میں پارلیمانی نظام ہو تو پارلیمنٹ میں اکثریتی جماعت کا قائد کابینہ بناتا ہے۔ کابینہ اپنی کارگزاریوں کے سلسلے میں پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے۔ پارلیمنٹ کے اراکین عوام کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔ صدارتی نظام میں عوام صدر اور پارلیمنٹ کے اراکین کو منتخب کرتے ہیں جو عوام کے روبرو جوابدہ ہوتے ہیں۔ اس طرح دورِ جدید میں عوام اپنے نمائندوں کے ذریعے کاروبارِ حکومت میں شریک ہوتے ہیں۔ (۱)

اسی ضمن میں وجاہت مسعود اپنی مشہور زمانہ کتاب "جمہوریت کیا ہے" میں رقمطراز ہیں:

> "جمہوریت ایک ایسا نظام حکومت ہے جو اس اساس اور اخلاقی اصول کو مد نظر رکھ کر ترتیب دیا گیا ہو کہ رنگ، نسل، زبان، جنس، قوم، مذہب، دولت، عہدے، سیاسی وابستگی، ثقافتی شناخت، سماجی خیالات اور علمی نکتہ نگاہ کے خیالات سے قطع نظر تمام انسان رتبے اور حقوق کے اعتبار سے۔ انہیں معاشرے میں تحفظ، نشوونما اور معاشی ترقی کے ایک جیسے مواقع ملنے چاہئیں۔ ہر شہری کو فیصلہ سازی اور انتظام مملکت میں حصہ لینے کا ایک جیسا حق حاصل ہے۔" (۲)

جمہوریت کی جامع تعریف میں خود علمائے سیاست کا بڑا اختلاف ہے، لیکن بحیثیت مجموعی اس سے اس طرح کی حکومت مراد لی جاتی ہے کہ جو لوگوں کی رائے پر حکومتی پالیسیاں مرتب کرے اور پالیسیاں تشکیل دیتے وقت عوام کی رائے کو اساس بنائے

جمہوریت کی مختصر تاریخ:

جمہوریت کا سراغ سب سے پہلے ہندوستان میں ملتا ہے۔ سو برس قبل مسیح یعنی گوتم بدھ کی پیدائش سے قبل ہندوستان میں جمہوری ریاستیں موجود تھیں جنہیں" جن پد "کہا جاتا تھا۔ یونان میں بھی جمہوریت موجود رہی ہے لیکن وہاں جمہوریت کا تصور سادہ اور محدود تھا۔ سادہ اس معنی میں کہ یونان میں جو ریاستیں تھیں وہ شہری ریاست

---

(۱) اسلام اور سیاسی نظریات، مفتی تقی عثمانی، مکتبہ معارف القران کراچی، ۲۰۱۰ء ص:۹۲

(۲) جمہوریت کیا ہے، وجاہت مسعود، ص:۳

کہلاتی تھیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے شہروں پر مشتمل چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک شہر ایک مستقل حکومت ہوتا تھا، دوسرا شہر دوسری حکومت اور تیسرا شہر تیسری حکومت۔ یونان کا سب سے بڑا شہر ایتھنز تھا یہ دس ہزار افراد پر مشتمل تھا بادشاہ بڑے فیصلوں میں عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے ساری آبادی کو اکھٹا کر لیتے تھے اس کا نتیجہ یہ نکلا جمہوریت کا حقیقی تصور یعنی عوام کو پالیسی سازی میں حصہ دار بنایا جائے گا اور اس کی جگہ مطلق العنان بادشاہ نے لے لی۔ یوں چھوٹی چھوٹی بادشاہتوں کے قیام کے بعد جمہوریت کا تصور ناپید ہو گیا مختصر یہ کہ جمہوریت وہ نظام حکومت ہے جو انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے انسانوں کی اکثریتی رائے کے مطابق وجود میں آتا ہے۔ اس طرزِ حکومت میں اکثریت تو ہوتی ہے لیکن علم و دانش اور عقل و فراست رکھنے والوں کی اکثریت ضروری نہیں بلکہ اگر کم عقل اور کم فہم لوگوں کی اکثریت ایک غلط فیصلے کو جمہوریت کے ذریعے نافذ کرنا چاہیں تو اقلیت میں اہلِ عقل اس کو روکنے کا حق نہیں رکھتے۔ اسی لیے مشہور مشرقی فلسفی ڈاکٹر علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے جمہوریت پر یوں تبصرہ کیا ہے:

"جمہوریت وہ نظام ہے جس میں بندں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا"(۱)

جمہوریت کا مفہوم واضح ہونے کے بعد جمہوری ریاست کے تعارف پر روشنی ڈالنی مقصود ہے۔

جمہوری ریاست سے مراد ایسی ریاست ہے جس میں عوام اپنے نمائندوں کا انتخاب خود کرتے ہیں، یا دوسرے لفظوں میں اپنے لیڈروں کا احتساب بذریعہ ووٹ کرنے کا نام حقیقی جمہوریت ہے۔ جمہوریت میں مطلق العنانیت نہیں ہوتی بلکہ اجتماعی فیصلوں کا اختیار عوام کے منتخب کردہ نمائندوں کے پاس ہوتا ہے۔ اور عوام کارکردگی کی بنیاد پر منتخب نمائندوں کی باعزت طریقے سے تبدیلی کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔

حق رائے دہی:

جمہوریت کی بہت بڑی خوبصورتی ہے کہ جمہور کی رائے کے مطابق حکمرانی کا طریقہ کار عمل میں لایا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں ہاتھ کھڑا کرنے کے اشاروں سے یا زبان سے اقرار کرنے سے جمہوریت کا ابتدائی مرحلہ شروع ہوا تھا جو آج صدیاں گزرنے کے بعد خفیہ رائے شماری اور الیکٹرونک ووٹنگ تک پہنچ چکا ہے۔

جمہوریت میں حق رائے دہی کے ذریعے عوام کو درج ذیل اختیارات حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ کسی ذمہ داری یا کسی کا حاکمانہ اختیارات سے قانونی طور پر معافی یا استثناء

۲۔ عمومی یا خصوصی اختیار جو انفرادی طور پر کسی فرد یا اجتماعی طور پر کسی جماعت کو دیا گیا ہو۔

۳۔ مملکت کی ہیئت ترکیبی میں پورے حقوق کے ساتھ شمولیت

۴۔ شہریت کا حق

---

(۱) کلیات اقبال، شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۱

۵۔ ملکی الیکشن میں آزادانہ رائے کا حق "خصوصاً پارلیمنٹ یا کونسلوں کے اراکین کے چناؤ میں"
۶۔ وہ قواعد جن پر اس صلاحیت کے حصول کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔
مندرجہ ذیل کو جمہوری ریاست میں اہمیت حاصل ہے۔

۱۔ وطن:

جمہوری نظام میں ایک نمایاں چیز" تصورِ وطن" ہے کہ تاریخی جغرافیائی، لسانی، قومی، تہذیبی وغیرہ کی بنیادوں پر وجود میں آتے ہیں۔ اور جب ان بنیادوں پر یہ وطن وجود میں آتے ہیں تو پھر از خود "خود مختاری" کا خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہر ملک بنیادی طور پر خود مختار ہے اور وہ ملکی مسائل طے کرنے میں بلکل آزاد ہے۔ یوں "نیشن اسٹیٹ" کا تصور سامنے آتا ہے۔ لیکن اسلام اس قسم کے نظریات کو رد کرتا ہے جس میں لسانی، قومی تعصب کو اساس بنایا گیا ہو۔ کیونکہ اسلام کا مزاج الگ ہے وہ پورے عالم کے مسلمانوں کو جسدِ واحد کی مانند جوڑتا ہے اور انہیں ایک امت قرار دیتا ہے۔

﴿كُنتُم خَيرَ اُ مَّة اُخرِجَت لِلنَّاسِ﴾ (۱)

ترجمہ: "ہو تم بہترین امّت جس کو عوام الناس کی (بھلائی) کے لیے نکالا گیا ہے۔

یہی وہ وطن کی "شرکیہ " سوچ ہے جس کی وجہ سے ساری امّت کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور امّت قومی ،لسانی، عصبی، گروہی اور جغرافیائی تقسیموں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اسی سوچ کو ختم کرنے کی بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن ہے وطن کا وہ مذہب کا کفن ہے۔

برعکس اس کے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ہی کی زبانی اسلام کی سوچ ہے کہ؛

اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے۔

۲۔ اختیارات کی تقسیم

اسلام میں "اختیار" یا "امر" شرعی اعتبار سے اہل ایک صالح خلیفہ کے گرد گھومتا ہے۔ مختلف معاملات میں مشورہ کے لیے صاحب الرائے افراد پر مشتمل شوریٰ تو ہوتی ہے مگر خلیفہ کے پاس اصل اختیارات ہوتے ہیں لیکن

(۱) سورۃ آل عمران: ۳/ ۱۱۰

Liberal Democracy کے اصول کے تحت اس کو تقسیم کر دیا گیا۔لہذا "الحکم" کی جگہ "تثلیثِ حکم" قائم کی گئی اور ان تینوں کو خود مختار قرار دیا گیا۔ جس کو آج ہمارے ہاں ریاست کے "تین ستون" کا نام دیا جاتا ہے۔

۱۔مقنّنہ ۲۔عدلیہ ۳۔انتظامیہ

اسی کے پھیل جانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ:

(لتنتقضن عری الاسلام عروة فکلماانتقضت عروة الناس بالتیٖ تلیھافاولھن نقضاالحکم واخرھن الصلوة) (۱)

"جب دین میں کوئی ایک چیز ٹوٹ جائے گی تو لوگ بقیہ چیزوں پر قناعت کر لیں گے، یہاں تک کہا آخری چیز بھی ٹوٹ جائے گی۔ پھر جو چیز سب سے پہلے ٹوٹے گی وہ "الحکم" ہو گی اور سب سے آخر میں ٹوٹنے والی چیز "الصلوة" یعنی نماز ہو گی"۔

۳۔حکومت اور مذہب کی علیحدگی:

نظام جمہوریت کے بنیادی عناصر میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ حکومت اور مذہب کا باہمی تعلق ختم کر دیا جاتا ہے۔ یعنی مذہب کو ریاست اور اس کے قوانین و معاملات میں کسی عمل دخل کی اجازت نہیں ہوتی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ:

جدا ہو دین سے سیاست تو رہ جاتی ہے چنگیزی

چنانچہ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ

((الا ان رحاالاسلام دائرةفدوروامع الکتاب الاان الکتاب والسلطان ستفرقان فلاتفارقوا الکتاب)) (۲)

"اسلام کی چکی گردش میں ہے تو جدہر قرآن کا رخ ہوا اسی طرف تم بھی گھوم جاؤ، ہوشیار رہو! قرآن اور اقتدار عنقریب الگ الگ ہو جائیں گے (خبر دار) قرآن کو نہ چھوڑنا"۔

۴۔مذہبی مساوات:

اسی طرح آزاد جمہوری نظام میں مذہبی مساوات بھی ہوتی ہے۔ جس میں ہر مذہب کے پیروکارں کو اپنے مذہب کے پرچار کی آزادانہ اور کھلی اجازت ہوتی ہے۔ جبکہ اسلامی نظام میں سوائے اسلام کے ہر مذہب کو چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے مذہب اور عقائد کی تبلیغ کی اجازت ہوتی ہے۔اسلام اس کی ہر گز اجازت نہیں

---

(۱)شعب الایمان،۴/۳۲۶

(۲)المعجم الکبیر (معجم الطبراني الكبير، سليمان بن أحمد بن أيوب الطبراني أبو القاسم ، مكتبة ابن تيمية ،۲۰۰۸، ۱۷/۷۸

دے سکتا کہ مشرکانہ اور باطل عقائد کی کھلم کھلا تبلیغ کی اجازت دی جائے اور لاکھوں لوگوں کو مرتد اور اسلام سے متنفر کر دیا جائے۔ جس کی مثال خود ہمارے ملک میں موجود ہے کہ عیسائی اور قادیانی مشینریز کے ذریعے کس طرح ہر سال ہزاروں مسلمان اسلام کی نعمت عظمیٰ سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور مرتد ہو جاتے ہیں۔

۵۔سیاسی مساوات:

نیز جمہوری نظام میں منتخب عوامی نمائندوں کی اکثریت کی رائے کو ترجیح حاصل ہوتی ہے اور ان کی رائے سے قوانین بنتے ہیں، چاہے شریعت کے موافق ہوں، یا شریعت کے خلاف ہوں اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی۔اسی طرح جمہوریت میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تعلیم سے ناواقف،عالم اور جاہل،ماہر فن اور فن سے نابلد، چوکیدار، کلرک ،صحافی،ماہر نفسیات،ماہر سیاسیات، پروفیسر، معیشت دان، تاجر،مزدور،عورت،مرد حتیٰ کہ مسلم اور غیر مسلم کی حیثیت برابر اور ان کی رائے اور ووٹ کا ایک ہی مقام اور درجہ ہوتاہے۔یہ بات نہ صرف خلاف اسلام بلکہ سراسر خلاف عقل و دانش ہے۔ہر شخص نہ تو ایک جیسی عقل وذہانت کا مالک ہوتا ہے اور نہ ہی ایک جیسی صلاحیت رکھتا ہے،اسی لیے ان کی آراء اور نظریات میں بھی واضح فرق ہوتا ہے۔اسلام نہ صرف یہ فرق مانتا ہے بلکہ واضح کر دیا ہے کہ صاحب علم اور جاہل ہر گز برابر نہیں ہوسکتے۔ارشاد باری ہے کہ:

﴿قل هل يستوى الّذين يعلمون والّذين لا يعلمون اِنَّمَا يتذكر اُولُوۡاالۡاَلۡبَابِ﴾[1]

''آپ کہہ دیجئے کہ کیا علم والے اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں بیشک اس میں اہل عقل کے لیے نصیحت ہے''۔

در اصل حکومت اور ملکی نظم و نسق چلانے کے لیے دیگر شعبہ ہائے زندگی کی بنسبت زیادہ صلاحیت و استعداد کی ضرورت ہوتی ہے۔اَن پڑھ اور جاہل عوام جنہیں سیاسیات کی ابجد سے بھی واقفیت نہیں ہوتی وہ نظام حکومت کو چلانے کے مستحق کیسے قرار پاسکتے ہیں؟ نیز جب انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ملکی معاملات اور نظم و نسق کو کیسے چلایا جاتا ہے انہیں یہ کیسے معلوم ہو گا کہ فلاں شخص ملکی نظم و نسق چلانے کا زیادہ مستحق ہے۔ لہذا وہ صحیح اور باصلاحیت افراد کو بھی بطور نمائندہ منتخب کرنے سے قاصر ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اوپر ذکر کردہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۱۶ کے اگلے حصہ میں انسانوں کی عظیم اکثریت کی ذہنی ناپختگی اس طرح سے قرآن حکیم نے واضح فرمائی:

﴿ان يتبعون الّا الظّن وان هم الّا يخرصون﴾[2]

ترجمہ:"وہ پیروی نہیں کرتے مگر گمان کی اور وہ نہیں لگاتے مگر صرف تخمینے"

---

(۱)سورۃالزمر:۹/۳۹

(۲)سورۃالاعراف:۷/۱۱۶

علامہ اقبال کی زبانی:

اس راز کو ایک مردِ فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کے دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں
تولا نہیں کرتے۔

فصل دوم:

جمہوری ریاست کا آغاز وارتقاء

جمہوری ریاست کا آغاز وارتقاء:

یہ اٹھارویں صدی کے اختتام کا زمانہ ہے اس وقت فرانس اور یورپی ممالک میں بادشاہت کا نظام رائج تھا۔اس وقت فرانس میں اس دور میں جو شہنشاہ حاکم تھا اسے لوئی کے نام سے جاناجاتاہے،لوئی نام کے بہت سارے بادشاہ گزرے ہیں لیکن ان کے نمبر بدلتے رہتے تھے یہ سولہواں لوئی تھا جس کی اس وقت حکومت تھی اس وقت کے بادشاہوں کی طرح لوئی کی بھی اپنی مجلسِ شوریٰ تھی جسے senate general کانام دیاگیاتھا۔یہ تین طبقات پر مشتمل تھی

1۔کلیسا کے ارکان

2۔جاگیردار حضرات

3۔عوام الناس

یہ ان کی الگ الگ مجالس تھیں یعنی سب کا الگ الگ اجلاس ہوتا تھا اتنی بات ضرور تھی کہ ان تینوں میں افراد کی تعداد برابر تھی جتنے کلیسا کے ارکان تھے اتنے ہی جاگیردار اور اتنے ہی عوام کی تعداد تھی ۔اب اگر مجلس شوریٰ سے قرارداد پاس کرانا مقصود ہوتی تو اکثر بیشتر کلیسا کے ارکان اور جاگیردار آپس میں گٹھ جوڑ کر لیتے اور قرارداد منظور کروا لیتے اور عوام بے اثر ہو کے رہ جاتی عوام کی آواز کی کوئی قدرومنزلت نہ ہوتی ۔ستم بالائے ستم یہ تھا کہ اس مجلس کا اجلاس بلانا بادشاہ کا صوابدیدی اختیار تھا جب چاہا بلالیا جب مرضی نہ ہوئی تو نہ بلایا ۔ چنانچہ ۱۷۸۹ء تک ۱۱۶ سال سے سینٹ کا اجلاس نہیں بلایا گیا تھا ۔جب فلسفی لوگوں کے افکار لوگوں میں پھیلنے شروع ہوئے تو یہ مطالبہ زور پکڑنا شروع ہوا کہ ۱۱۶سال سے سینٹ کا اجلاس نہیں بلایا گیا لہٰذا سینٹ کا اجلاس بلایا جائے۔جب کہ بادشاہ لوئی اپنی شاہ خرچیوں میں مگن تھا اور اسے اپنی عیاشیوں اور شاہ خرچیوں کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی جس کا واحد ذریعہ مزید ٹیکس تھا بادشاہ کو یہ موقع مناسب معلوم ہوا کہ لوگوں کے مطالبے پر سینٹ کا اجلاس بلالیتا ہوں اس میں مزید ٹیکس لگانے کی منظوری پر کلیسا اور جاگیر داروں کو راضی کر لوں گا جن کا راضی کرنا بادشاہ کے لیے کوئی مشکل امر نہ تھا کیوں کہ دونوں کے مفادات بادشاہ کے مفادات سے وابستہ تھے ۔اس مقصد کے لیے خوش فہمی میں لوئی نے سینٹ کا اجلاس طلب کرلیا ۔لیکن عوام نے سینٹ کے اجلاس کے مطالبے کے بعد ایک نیا مطالبہ شروع کردیا اور عوام کا یہ مطالبہ جائز بھی تھا کہ سینٹ میں عوام کی تعداد ایک تہائی ہے جو کہ سراسر ناانصافی ہے ،عوام کا مطالبہ تھا کہ ان کی تعداد

کلیسا کے ارکان اور جاگیرداروں کے ارکان کے مساوی کی جائے۔یہ آسانی سے ماناجانے والا مطالبہ نہ تھا اس کے لیے عوام نے مظاہرے شروع کئے جس کے نتیجے میں بادشاہ کو عوام کا مطالبہ ماننا پڑا۔[1]

سب سے پہلی قومی اسمبلی کے قیام کا اعلان:

جب بادشاہ لوئی نے عوام کے دونوں مطالبے مانے تو عوام کی طرف سے ایک نیا مطالبہ سامنے آگیا کہ جو سینٹ کے اجلاس الگ الگ ہوتے ہیں یہ اکھٹے ہوں اس میں اکثریتی رائے سے جوبات طے ہووہ قابلِ قبول ہو۔لیکن بادشاہ یہ ماننے پر آمادہ نہ ہوا، کیوں کہ بادشاہ کو پتہ تھا اس طرح عوام غالب آجائے گی اور عوام کا غلبہ بادشاہ کو کسی صورت قبول نہیں تھا۔بادشاہ کے انکار کرنے کے بعد عوام نے آپس میں طے کرلیا کہ ہم عوام اپنی قومی اسمبلی قائم کرلیتے ہیں۔قومی اسمبلی کا لفظ سب سے پہلے وہیں وجود میں آیا اس طرح دنیا کی پہلی قومی اسمبلی وجود میں آئی۔عوام نے اپنا ایک الگ ایوان بنا لیا اور اس کو قومی اسمبلی کا نام دیا ،اور اس کا اجلاس طلب کرلیا۔جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ اب ہمیں کلیسا اور جاگیرداروں سے کوئی سروکار نہیں اب ہم خود قومی اسمبلی کا اجلاس بلائیں گے اس میں اپنی مرضی کے فیصلے کریں گے۔

جمہوریت کے علمبرداروں پر تشدد:

باشاہ کے لیے یہ صورتِ حال بلکل نئ تھی بادشاہ نے اس کا راستہ روکنے کے لیے تشدد کا راستہ اختیار کیا جو کہ عموماًاسے موقعوں پر حکمران کرتے ہیں سو بادشاہ لوئی نے بھی کیا اور اپنی فوج کو اس جگہ کا محاصرہ کرنے کو کہا جہاں عوام نے اجلاس کرنا تھا لیکن عوام جب عزم کرلیں تو کوئی زمینی قوت عوام کا راستہ نہیں روک سکتی عوام نے دوسری جگہ ایک ٹینس کورٹ میں اجلاس رکھ لیا اور وہاں اپنی قومی اسمبلی کا اجلاس کیا ۔

جمہوری ریاست کا پہلا دستور :

عوام نے اپنے قومی اسمبلی کے اجلاس میں سوچ و بچار کے بعد ایک نیا دستور بنایا اور اسے اس اجلاس سے منظور کروایا عوام نے اپنے پہلے اجلاس میں ملک کو ایک نیا دستور دیا۔

پہلی جمہوری ریاست کے دستور کی بنیادیں

عوام نے قومی اسمبلی سے جو دستور پاس کروایا اس کی بنیاد انہوں نے تین ستونوں پر رکھی

---

(۱)انقلاب فرانسہ،ڈاکٹر محمد مظلوم خراسانی،تہران،ایران،۲۰۰۱ء،ص:۹۲

1۔مقننہ

2۔عدلیہ

3۔انتظامیہ

عوام نے ان تینوں کو الگ کر کے تینو ں کے اختیارات الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دیئے اور فرد کو بادشاہ کے ظلم تسلط سے آزاد کرنے کا بنیادی منصوبہ تیار کرلیا لیکن لوئی کی حکومت نہ ختم کی اس دستور میں بادشاہ کا اختیار صرف انتظامیہ تک محدود کردیا گیا تھا اور عدلیہ اور مقننہ کو بادشاہ کے اثر سے نکال دیا تھا بادشاہ کا عدلیہ اور مقننہ سے کوئی تعلق نہ ہوگا بادشاہ صرف انتظامی معاملات دیکھے گا انتظامی معاملات ہی بادشاہ کے ماتحت ہوں گے۔[1]

پہلی جمہوریہ:

یہ وہ پہلا دستور تھا جو اس قومی اسمبلی نے منظور کیا جسے فرانس کا بھی پہلا دستور کہا جاتا ہے جسے پہلی جمہوریہ کانام دیا گیا تھا۔

جس وقت عوام کی قائم کردہ اسمبلی کی میٹنگ ٹینس کورٹ میں ہورہی تھی اس وقت بادشاہ کے محل پر عوام کا جمِ غفیر موجود تھا جو بادشاہ سے مسلسل اس اجلاس میں شرکت پر زور دے رہا تھا آخر کار بادشاہ کو زبردستی اجلاس میں لایا گیا اور زبردستی اس دستور پر دستخط کروائے گئے بادشاہ نے انتظامی معاملات کے اختیارات کو غنیمت جانا یہ تو مجھے حاصل ہیں عدلیہ مقننہ نہیں ہیں لیکن حکومت تو ہے اس لیے بادشاہ نے بھی دستخط کر دیئے جس سےوہ دستور منظور ہوا۔

بادشاہ لوئی کا ردِ عمل اور اس کا انجام :

بادشاہ لوئی نے کافی سوچ و بچار کی کہ ابھی تو پہلا اقدام ہے کہ مجھ سے عدلیہ اور مقننہ کے اختیارات چھینے گئے لیکن وہ وقت دور نہیں کہ مجھے انتظامی معاملات سے بھی الگ کردیا جائے گا اور میری حکومت کا خاتمہ کردیا جائے گا۔اس نے عوام کے سیلابی ریلے کو روکنے کے لیے جرمنی کے بادشاہ سے رابطہ کیا جو کہ اصل میں جرمنی کے باشاہ کا بھی دکھ تھا کیوں کہ جرمنی میں بھی اس وقت بادشاہت قائم تھی جرمنی کے بادشاہ نے اپنے بچاؤ کی خاطر بھی فرانس کے بادشاہ کا ساتھ دینے پر آمادگی کا اظہار کیا کہ یہ بلا کہیں گلے نہ پڑ جائے لہٰذا مل کر فرانس کی عوام کو کچل ڈالیں گے ۔اس سے پہلے کہ جرمنی

(۱)انقلاب فرانسہ،ڈاکٹر محمد مظلوم خراسانی،ص۹۳

کی فوج آتی بادشاہ لوئی کا جرمنی کے بادشاہ سے رابطہ کرنا عوام پر آشکارہ ہوگیا ۔عوام نے بادشاہ کو گرفتار کر کے جیل میں بند کردیا۔اس پر مقدمہ چلا کہ اس نے جرمنی کے بادشاہ سے مل کر فرانس کی عوام کو مارنے کا پروگرام بنایا تھا۔اس پر یہ جرم ثابت ہوا اس کو سزائے موت دی گئی اور اس کا سر قلم کیا گیا۔[1]

جمہوریت کے ارتقاء میں اہم کردار:

اس کے بعد فرانس میں انقلابیوں کی حکومت آئی لیکن وہ اپنی ناتجربہ کاری کی بنیاد پر حکومت سنبھال نہ سکے اور خانہ جنگی ،لاقانونیت ،دہشتگردگی کا دور دورہ شروع ہوا جس کے نتیجے میں فرانس کی عوام ایک مرتبہ پھر بادشاہت کو ترجیح دینے لگی اور عوام نے انتظامی امور کو چلانے کے لیے فوج سے مدد حاصل کرلی اس وقت فوج کا سربراہ نپولین بونا پارٹ تھا چنانچہ عوام نے بادشاہت کو اپنے بچاؤ کی امید سمجھتے ہوئے نپولین کو اپنا بادشاہ بنا دیا۔پہلی فرانسیسی سلطنت (۱۸۰۴ء تا۱۸۱۴ء)عظیم فرانسیسی سلطنت اور نپولنی سلطنت بھی کہلاتی ہیں۔ یہ نپولین اوّل کی بادشاہت تھی۔ جو۱۹ویں صدی میں بر اعظم یورپ کی غالب طاقت تھی ۔

نپولیئن۱۸ مئی(۱۸۰۴ء)میں شہنشاہِ فرانس بناجب کہ اسی سال دسمبر میں تاج کا حق دار شہنشاہ بن گیا، جس کے متصل بعد ہی فرانسیسی قونصلیٹ ختم ہوئی۔نپولیئن نے آسٹریا ، پروشیا ، پرتگال ،روس اور اتحادی ملکوں کے خلاف تیسرے اتحاد کی لڑائی خاص کر آسٹرلینز کی جنگ ۱۸۰۵ءاور فریڈ لینڈ کی لڑائی(۱۸۰۷ء)میں پہلی جنگی کامیابیاں سمیٹیں۔ جولائی۱۸۰۷ء میں معاہدہ ٹیلسٹ کی بدولت براعظم یورپ میں دو سال سے جاری خونریزی ختم ہوئی۔

اس کے بعد آنے والے سالوں کی جنگی کامیابیوں کو نپولیئن کی جنگیں یا نپولینی جنگوں کا نام دیا جاتا ہے، جس سے فرانس کی حدود میں اکثر علاقہ مغربی یورپ کا ،اور پولینڈ بھی شامل ہوگیا۔ ۱۸۱۲ء میں فرانس اپنے عروج پر تھا اس زمانے میں فرانس ۱۳۰ صوبوں پر مشتمل تھا۔اور فرانس کی آبادی اس وقت چار کروڑ چار لاکھ سے متجاوز تھی۔ فرانس کی مملکت جرمنی ،اٹلی، سپین سے ہوتی ہوئی وارسا کی ریاست کو جا لگتی تھی اور پوری مملکت میں پھیلی ہوئی اپنی فوجی قوت اور آسٹریا و پروشیاکے ساتھ اس کا اتحاد تھا۔ پہلے پہل کی فرانسیسی کامیابیوں نے فرانس کے انقلاب کے اپنے نظریات کے اثرات پورے یورپ میں پھیلا دیئے ۔

---

(۱)انقلاب فرانسہ،ڈاکٹر محمد مظلوم خراسانی، تھران،۲۰۰۱،ص۹۲

بے شک کہ ایبیریا میں جنگ پینینسولر میں شکست نے مملکت فرانس کو بہت متاثر کیا ، لیکن ۱۸۰۹ء کی آسٹریائی مملکت کے مقابلے میں پانچویں اتحاد کی لڑائی میں کامیابی کے بعد نپولین نے سلطنتِ روس پر چڑھائی کرنے کی غرض سے چھ لاکھ جوان تیار کئے جن سے اس نے ۱۸۱۲ء میں روس پر جارحیت کی۔۱۸۱۳ء میں چھٹے اتحاد کی لڑائی کے سبب فرانسیسی فوجوں کا جرمنی سے انخلا عمل میں آیا[1] ۔

۱۸۱۴ء میں نپولین تخت سے دستبردار ہو گیا ۔ ۱۸۱۵ء مملکت مختصر مدت کے دران (سو دن) دوبارہ بحال ہو گئی جو واٹرلو کی لڑائی میں نپولین کی ہار تک چلتی رہی۔اس کے بعد بوربون خاندان کی حکومت کا آغاز ہوا۔

لیکن نپولین کو کریڈٹ جاتا ہے کہ باوجود اس کے کہ عوام نے اس کو اپنا بادشاہ بنایا ۔عوام نے خود اس کے سر پر بادشاہت کا تاج سجایااور تمام اختیارات کا مالک بنایا ۔لیکن اس سب کے باوجود اس نےماضی کے انقلاب کو ایک عظیم فکر قرار دیا اور اس کا کریڈٹ انقلابیوں کو دیا یہی وہ شخص ہے جس نے جمہوری ریاست کے ارتقاء میں بنیادی کردار ادا کیا ۔

نپولین کی موت اور جمہوریت کا ارتقاء:

نپولین بڑا فاتح تھا اس نے بہت سے ملک فتح کئے تھے آسٹریا جو کہ سب سے بڑا مدِ مقابل تھا اس کو شکست دی اور مصر تک پہنچا اس دوران اس نے اپنے ساتھیوں کی جماعت تیار کی ۔نپولین کے سارے ساتھی انقلابی فکر کے تھے ۔نپولین کی موت کا سبب برطانیہ سے شکست بنی نپولین کی برطانیہ سے ٹکر ہوئی تو واٹر لو کے مقام پر اسے شکست ہوئی جس کے بعد نپولین کا انتقال ہو گیا ۔نپولین کے انتقال کے بعد نپولین کے رفقاء نے دوبارہ جمہوریت کی بنیاد ڈال دی ۔اس کی بنیاد پر مکمل جمہوری نظام قائم کیا گیا اور اس کے زیرِ اثر یعنی فرانس کے زیرِ اثر یورپ کے تمام ملکوں میں انقلاب آتا چلا گیا ۔

جمہوریت کے نتیجے میں فروغ پانے والے اقدار :

اس انقلاب کو انقلاب فرانس کا نام دیا جاتا ہے۔جس نے یورپ میں تین اقدار کو فروغ دیا۔

1۔فرد کی آزادی

2۔اختیارات کی تفریق

3۔سیاست اور مذہب کی تفریق

جس کی وجہ سے یورپ کے کئی ممالک میں یہ تصورات رائج ہوئے اور ان ملکوں میں لبرل، سیکولر جمہوریت متعارف ہوئی[1]۔

(۱) مفتی تقی عثمانی، اور سیاسی نظریات، مکتبہ معارف القرآن کراچی، ۲۰۱۰، ص ۹۶

فصل سوم:

جمہوری ریاست کے تشکیلی پہلو

جمہوری ریاست کے تشکیلی پہلو:

جمہوری ریاست کی عملی تشکیل کے کئی پہلو ہیں اس سے پہلے کہ اس کی تشکیل کے عملی پہلو بیان کئے جائیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت کی اقسام اور نظام کو واضح کیا جائے۔

جمہوریت کی اقسام:

جدید دنیا میں جمہوریت کی دو مشہور اقسام بیان کی جاتی ہیں:

۱۔ پارلیمانی نظامِ جمہوریت

۲۔ صدارتی نظامِ جمہوریت

پارلیمانی نظامِ جمہوریت:

پارلیمانی نظامِ جمہوریت وہ نظام ہے جس میں عوام ایک مخصوص تعداد میں پورے ملک سے اراکین کا انتخاب کرتے ہیں اس کے بعد منتخب شدہ اراکین ،منتخب شدہ اراکین میں سے ہی وزیراعظم اوروزرائے اعلیٰ کا انتخاب کرتے ہیں۔ پھروزیراعظم وفاقی سطح پراپنی کابینہ تشکیل دیتا ہے جبکہ تمام وزرائے اعلیٰ صوبائی سطح پر جداگانہ کابینہ تشکیل دیتے ہیں۔

پارلیمانی نظام (Parliamentary system) یا **پارلیمانی جمہوریت** (Parliamentary democracy) جمہوری حکومت کا وہ نظام ہے جس میں مجلس عاملہ کے وزراء پارلیمنٹ اور مقننہ کو جوابدہ ہوتے ہیں۔

پارلیمانی نظام ایک ایسا نظام حکومت ہے جس میں ایک کابینہ بالواسطہ یا بلا واسطہ پارلیمنٹ کے تحت کام کرتی ہے۔ اس نظام میں اختیارات عموماً وزیر اعظم کے پاس ہوتے ہیں۔ اس نظام میں صدر تو ہوتا ہے مگر صدر کے اختیارات بہت کم ہیں اور وزیر اعظم کے سب سے زیادہ اختیارات ہوتے ہیں۔

صدارتی نظام:

جمہوری طرزِ حکومت میں صدارتی نظام سے مراد ایسا نظام ہے جس میں عوام صدر کاانتخاب براہِ راست اپنے ووٹ کے ذریعے کرتے ہیں۔اورالیکٹرول کالج کے لیے سینٹرز کا انتخاب بھی براہِ راست عوام کے ووٹ کے ذریعے سے ہوتاہے۔صدارتی نظام میں کابینہ کے اراکین کے لیے پارلیمنٹ کا رکن ہونا شرط نہیں بلکہ صدراپنے صوابدیدی اختیارات استعمال کرتے ہوئے کسی بھی اہل ترین شخص کو وزارت دے سکتا ہے۔لیکن اس نظام کے قوانین کے مطابق کابینہ کے اراکین قانون سازی میں شامل نہیں ہو

سکتے۔صدارتی نظام میں قانون بنانے کا حق صرف الیکٹرول کالج کا ہوتا ہے،البتہ کابینہ ڈویژن میں غیر منتخب نمائندوں کو صدر اپنے صوابدیدی اختیار کے ذریعے وزارت تقسیم کرسکتا ہے۔

صدارتی نظام میں صدر کومندرجہ ذیل اختیارات حاصل ہوتے ہیں:

- صدر نئی وزارتیں تشکیل دے کر ان کی کارکردگی پر بھی نظر رکھ سکتاہے۔ اس کے علاوہ وہ پارلیمان کی منظوری کے بغیر سرکاری افسروں کو معطل کر سکتاہے۔
- صدر ججوں اور دفتر استغاثہ کے بورڈ کے چار ارکان تعینات کر سکتاہے جب کہ ملکی پارلیمانی بورڈ کے ارکان کی تعداد سات ارکان ہوتی ہے۔
- صدر ملکی بجٹ تشکیل دیتاہے اور ملکی سکیورٹی پالیسی کے بارے میں بھی فیصلہ کر نے کا مجاز ہے۔
- پارلیمان کی منظوری کے بغیر صدر ملک میں چھ ماہ تک کی مدت کے لیے ایمرجنسی نافذ کر نے کامجاز ہے۔
- صدر کو ملکی پارلیمان تحلیل کرنے کا اختیار بھی حاصل ہوتاہے[1]۔

جمہوریت کے تشکیل کے مختلف پہلو:

قوموں کی زندگی میں معاشروں کی سماجی تشکیل کا عمل بڑی بنیادی اہمیت رکھتاہے۔اس حوالے سے یہ بات بڑی ضروری قرار پاتی ہے کہ سب سے پہلے سماجی تشکیل کے بنیادی اصول و نظریات کا تعین کیا جائے۔ چنانچہ قوموں کی زندگی میں سب سے پہلے فکر و فلسفے کی اساس پر وحدتِ فکر کا موجود ہونا ضروری ہے دوسرے مرحلے پر ان نظریات وافکار کی اساس پر کسی جغرافیائی حدود میں بسنے والے انسانوں کے اجتماعی اعمال کی شیرازہ بندی کی جاتی ہے۔ یعنی اس فکر کو عمل میں لانے کی درست حکمتِ عملی اختیار کی جاتی ہے۔ پھر تیسرے مرحلے پر اس فکر اور فلسفے پر مبنی عملی سیاسی اور معاشی نظام تشکیل دیا جاتا ہے۔ قوموں کی ترقی کا راز، دنیا میں ان قوموں نے ترقی کی ہے، جنھوں نے اپنی نظریاتی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی تشکیل کے لیے سب سے پہلے تو ایک سکول آف تھاٹ متعین کیا۔یعنی اپنا فکر وفلسفہ اور نظریۂ حیات متعین کیا۔ اور پھر اسی فلسفے اور نظریے کی اساس پر انھوں نے اپنے لیے ایک سیاسی اور معاشی نظام تشکیل دیا۔ اور اسی کو پھیلانے کے لیے تعلیمی ادارے، نظم و نسق کا عمل اور سماجی نظام کی تشکیل کا عمل آگے بڑھایا۔ گردوپیش کے معاشروں کی غور طلب حقیقت، ہم نے اولاً جن باتوں کو مدّ نظر رکھنا ہے، وہ یہ کہ ہمارے گردو

(۱)جمہوریت کیا ہے، وجاہت مسعود، ناشر، بلیو ویز، اسلامیہ کلب بلڈنگ خیبر بازار، پشاور، ص:۲۶۹

پیش موجود معاشروں کی بنیادی ساخت کس نوعیت کی ہے؟ عالمِ اسلام کن بنیادی مسائل سے دو چار ہے؟ اور ان مسائل کی سماجی تشکیل کے نقطۂ نگاہ سے نوعیت کیا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے گرد و پیش اس وقت دنیا میں دو سکول آف تھاٹ پر مبنی نظام ہائے حیات کام کر رہے ہیں: ایک کیپٹل اِزم تو دوسرا سوشل اِزم۔ جن ممالک نے کیپٹل اِزم اختیار کیا ہے، انہوں نے سرمائے کی بنیاد پر اپنی جغرافیائی حدود میں بسنے والے افراد کی شیرازہ بندی کا ایک مکمل فلسفہ اور نظام قائم کیا۔ سرمائے کی بالادستی کی بنیاد پر انہوں نے اپنے سماجی ادارے تشکیل دیے اور عملی نظام بنائے۔ سیاسی، معاشی اور عدالتی نظام وضع کیے۔ اور ثقافتی اور تہذیبی سطح پر سرمائے کے فروغ کے لیے بہت سے ادارے بنائے۔ ان کے مقابلے پر دوسرے وہ ممالک ہیں، جنہوں نے سوشل اِزم اختیار کیا۔ انہوں نے محنت کشوں کی تنظیم کی اساس پر اپنی جغرافیائی حدود میں بسنے والے لوگوں کے لیے اپنے فکر و فلسفے پر مبنی ایک سماجی نظام قائم کیا۔ اور محنت کشوں کے تحفظ کے لیے ادارے تشکیل دیے۔ سیاسی، معاشی اور عدالتی نظام وضع کیے۔ الغرض ان دونوں مکتبہ ہائے فکر نے اپنے اپنے افکار و نظریات کی اساس پر اپنے اپنے معاشروں میں عملی نظام تشکیل دیئے ہیں۔

نظریاتی اور فکری سطح پر جمہوری تشکیل:

سماجی تشکیل کے لیے ایک نظریے اور فکر کی ضرورت ہے، لیکن اس حوالے سے جب ہم عالمِ اسلام کی طرف نظر مرکوز کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں ایک فکری اور نظریاتی بحران کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مسلم معاشرے خواہ عرب ممالک کے ہوں یا دیگر ممالک کے، ان میں انتہاپسندانہ نظریہ اور سوچ یہ پائی جاتی ہے کہ سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کو "دنیاداری" قرار دے کر دین کی تعلیمات سے الگ کر دیا گیا ہے۔ وہ دین کو صرف اس حد تک مانتے ہیں کہ دین کے کچھ عقائد اختیار کر لیے جائیں۔ اس کی کچھ رسوم ادا کر لی جائیں یا کچھ اعمال و وظائف کر لیے جائیں۔ سماجی تشکیل کے عملی مسائل کو دینی نقطۂ نگاہ سے حل کرنے کی سوچ کا فقدان پایا جاتا ہے۔ اور پھر اسی پر بس نہیں، بلکہ ان معاشروں میں موجود جتنے فرقے ہیں، ہر فرقے کی رسومات اور اعمال و وظائف دوسرے سے مختلف ہیں۔ گویا کہ ہمارے معاشروں میں نہ صرف سیاست اور معیشت سے متعلقہ مسائل سے بے اعتنائی پائی جاتی ہے، بلکہ سطحیت کی بنا پر فرقہ وارانہ سوچ بھی بڑی گہری نوعیت لیے ہوئے ہے۔ سماجی مسائل کے حل کرنے کے بنیادی پہلوؤں سے رُوگردانی اور مذہبی فرقہ بندی کا خطرناک نتیجہ گزشتہ پچیس تیس سال سے ہمارے مسلمان معاشروں میں اپنا اثر دکھا رہا ہے یعنی جس وقت ہم سیاسیات، سماجیات دین سے خارج کر دیتے ہیں اور معاشیات و معاملات کو دین سے الگ کر دیتے ہیں اور صرف عقائد یا مخصوص فرقے کے خیالات کو سامنے رکھتے ہیں۔ تو اس سے مذہبی انتہاپسندی پیدا ہوتی ہے۔ جو وجہ بنتی ہے خون ریزی، خوف بدامنی وغیرہ کی جو آج بھی اپنی بھیانک شکل میں

ہمارے سامنے موجود ہے اور پھر اگر ہمارے بعض مذہبی رہنماؤں نے معاشرتی تشکیل کے حوالے سے سیاست اور معیشت کی بات بھی کی تو زرعی اور تجارتی دور کی فقہی جزئیات کو سامنے رکھ کر گروہی اور طبقاتی بنیادوں پر اپنے خیالات و افکار کی دنیا بسائی۔ اور جدید صنعتی دور کے پیداواری رشتوں اور سیاسی تقاضوں کو سامنے رکھے بغیر سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل حل کرنے کا طریقۂ کار وضع کیا۔ اور یوں مذہب کو ان ملکوں میں موجود نو آبادیاتی دور کے نظام کا آلۂ کار بنا کر رکھ دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے مسلمان معاشروں سے جدید صنعتی دور کے تقاضوں کے تناظر میں سیاست اور معیشت پر مبنی مسائل کے حل کرنے کا شعور ختم ہو گیا۔ کتنا بڑا المیہ ہے کہ آج مسلمان نوجوان سماجی تشکیل کے دینی، سیاسی اور اقتصادی شعور سے بے گانہ ہو گیا ہے۔ سیاسی اور معاشی معاملات میں دینی افکار کو چھوڑ کر غلامی کے زمانے میں اغیار کی جانب سے پیدا کیے جانے والے فرقہ وارانہ اُمور میں مبتلا ہو گیا۔ اور اس کے نتیجے میں نظریاتی یکسوئی اور فکری وحدت سے محروم ہے۔[1]

جمہوری تشکیل کا بحران اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ تشکیل:

اس نظریاتی، سیاسی اور معاشی بحرانی کیفیت اور حالت سے نکلنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم سماجی تشکیل کے بنیادی امور کے بارے میں دین اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں واضح اور دوٹوک نظریہ اور فکر، عملی سیاسی اور معاشی نظام کے قیام کے لیے صحیح حکمتِ عملی اختیار کریں۔ اس حوالے سے سماجی تشکیل کے درجِ ذیل تین بنیادی اُمور کے بارے میں دینی تعلیمات کے تناظر میں اپنا نقطۂ نظر واضح کریں۔ اور بنیادی لائن آف ایکشن طے کریں۔ یعنی سوسائٹی کی تشکیل کی فکر اور نظریہ کیا ہے؟ اس نظریے کی اساس پر اس کے سیاسی نظام کی نوعیت کیا ہے؟ اسی نظریے کی اساس پر اس کے معاشی نظام کے بنیادی امور کیا ہیں؟ کوئی بھی معاشرہ ان تینوں دائروں کے اساسی اُمور متعین کر کے ہی ترقی کرتا ہے۔۔ آج کا تقاضا یہ ہے کہ اس بات کو سمجھا جائے کہ مجموعی طور پر انسانیت کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کے جسم و روح کے بنیادی تقاضوں کو حل کرنے کا صحیح طریقۂ کار کیا ہے؟ اس حوالے سے برعظیم پاک و ہند کے عظیم مفکر حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس حقیقت کی نشان دہی کی ہے کہ انسان نہ محض روح ہے اور نہ محض جسم ہے بلکہ وہ روح اور جسم دونوں کا مجموعہ ہے ان دونوں کے مجموعے سے نوعِ انسانیت کی صحیح سماجی تشکیل اور اس کی تکمیل ہوتی ہے۔[2]

---

(۱) جمہوریت کیا ہے، وجاہت مسعود، ص: ۱۹۰

(۲) حجۃ اللہ البالغہ، قطب الدین شاہ ولی اللہ، بیروت لبنان، ۱/۴۴

دینی نقطۂ نظر سے سماجی تشکیل کے اِن امور پر غور کی اہمیت:

اب سوال یہ ہے کہ دین کی تعلیمات ان تینوں امور کے بارے میں کیا ہیں؟ اب وہ دین اسلام، جو قیامت تک کے لیے آیا ہے، اس کی روشنی میں سماجی تشکیل کے حوالے سے ہمیں کیا کردار ادا کرنا ہے؟ سماجی تشکیل کے حوالے سے انسانی فلاح و بہبود کا نظریہ اور فکر، جہاں تک سماجی تشکیل کے لیے ایک نظریہ اور فکر متعین کرنے کی بات ہے، تو اس حوالے سے دین اسلام کی تعلیمات انسانی معاشروں کی تشکیل کے لیے "نوعِ انسانیت" کو اصل قرار دیتی ہیں۔ کتابِ مقدس قرآن حکیم پوری انسانیت کے لیے ہدایت اور راہنمائی کا ذریعہ ہے۔ اس کو ماننے والی جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پوری انسانیت کو کامیاب بنانے کی فکر پر کام کرنے والی ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کے واسطے سراپائے رحمت اور خداوند تعالیٰ پوری انسانیت کا ربّ ہے۔ جس سے یہی بات نکلنی چاہیے انسانی سماج اور اس کی تشکیل کی بنیاد خود انسان اور اس کے انسانی تقاضے ہونے چاہئیں۔ چاہے وہ انسان کوئی بھی ہو اس کا کوئی بھی رنگ، علاقہ یا مذہب ہو۔ اس طرح دیکھا جائے تو دین اسلام بلا تفریق رنگ، نسل، مذہب انسانی تقاضوں کی تکمیل میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ آج کی ضرورت یہ ہے کہ ہم فرقہ واریت اور گروہیت کے نظریے سے بالاتر ہو کر سماجی تشکیل کے لیے صرف انسانیت اور اس کے انسانی تقاضوں کو بنیاد بنائیں۔ انسانی مسائل حل کرنے کا طریقہ سوچیں۔ آج کا تقاضا اس بات کو سمجھنے کا ہے۔ کہ مجموعی طور پر انسانیت کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس میں جسم و روح کے بنیادی تقاضوں کو حل کرنے کا صحیح طریقۂ کار کیا ہے؟

انسانیت کے حوالے سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نقطۂ نظر:

اس حوالے سے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں کہ انسان نہ ہی صرف روح ہے اور نہ ہی صرف جسم ہے بلکہ انسان روح اور جسم، یعنی "ملکیت" اور "بہیمیت" دونوں کا مجموعہ ہے۔ اور ان دونوں کے مجموعے کی بنیاد پر انسانیت کی حقیقت اور اس کے تقاضوں کو سمجھا جانا چاہیے۔ بنی نوعِ انسان کی کامیابی وکامرانی کا نظریہ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مَلکی اور حیوانی تقاضوں کی مجموعی تکمیل کے حوالے سے ہی انسانی سماج کا نظام تشکیل پانا چاہیے۔ انسانی تقاضوں کی تکمیل کے اَخلاقِ اربعہ اور ارتفاقاتِ اربعہ، امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ دینِ اسلام کی تعلیمات اور ان کے عملی نظام پر مبنی ایک ہزار سال کی عظیم الشان تاریخ کا تحلیل و تجزیہ کرتے ہوئے اس بات کا تعین کیا کہ انسانی روح کی تکمیل کے لیے عبادات اور اَخلاقیات کے نظام کی ضرورت ہے۔ اور اس کے جسم اور حیوانی تقاضوں کی درست تکمیل کے لیے ارتفاقات کی ضرورت ہے۔ چنانچہ قرآنی تعلیمات کے مطابق انسانیت

کے بنیادی اَخلاق چار ہیں۔ اور اس کی سماجی ترقی کے ارتفاقات بھی چار ہی ہیں۔ ان دونوں کے مجموعے سے نوعِ انسانیت کی صحیح سماجی تشکیل اور اس کی تکمیل ہوتی ہے۔[1]

(۱) حجۃ اللہ البالغہ، قطب الدین شاہ ولی اللہ، بیروت لبنان، ۱/۴۴

فصل چہارم:

جمہوری ریاست کے بنیادی نظریات

جمہوری ریاست کے بنیادی نظریات:

کسی بھی جمہوری ریاست کے بنیادی نظریات درج ذیل ہوتے ہیں:

۱۔ اقتدار اعلیٰ، عوام کی ملکیت:

جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ یا طاقت کا سرچشمہ عوام کو حاصل ہے۔ جمہوریت مطلق العنانی یا آمریت سے مکمل طور پر مختلف نظام ہے۔ قدیم بادشاہی نظام میں یہ مفروضہ کارفرما تھا کہ کسی خاص طبقے یا خاندان کو حقِ حکمرانی الوہی طور پر ودیعت کیا گیا ہے اسی طرح آمریت کا مطلب ہے طاقت کے بل بوتے پر حکومت غصب کرنا اور جمہوری تقاضوں سے بے نیاز ہو کر شخصی مفاد اور تعصبات کی روشنی میں حکومت چلانا۔

جمہوریت کی بنیاد اس اصول پر رکھی گئی ہے کہ تمام شہری انتظام حکومت میں برابری کی سطح پر حصہ لے سکتے ہیں، خواہ وہ ووٹ کے ذریعے اپنا حق استعمال کریں یا کسی بھی منتخب ادارے کے لیے امیدوار بن جائیں اور طے شدہ طریقہ کار کے مطابق انتخابات میں حصہ لیں اور براہِ راست انتظام مملکت میں شامل ہوں۔ جمہوریت میں طاقت کا سرچشمہ معاشرے میں بسنے والے تمام انسان ہیں۔ دراصل جمہوریت کی اصطلاح ہی عربی لفظ 'جمہور' سے نکلی ہے جس کا مطلب ہے "عوام" جمہوریت کا لغوی مطلب عوام کی حکومت۔

جمہوری ریاست میں اقتدار کا سرچشمہ عوام (جمہور) ہوتے ہیں۔ چنانچہ جمہوریت میں بلند ترین مقام عوام کی رائے کو حاصل ہوتا ہے اور جمہوری نظام کی اعلیٰ ترین ترجیح عوام کی حفاظت اور ترقی ہے۔ (۱)

۲۔ اختیارات وحدود کا توازن:

جمہوریت میں اقتدارِ مطلق، کلی اختیارات کے ارتکاز کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس میں بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ افراد اور ادارے غلطی سے بالا ہیں۔ اگر انہیں مکمل اختیار مل جائے اور ان پر کوئی روک ٹوک نہ ہو تو اصول وضوابط کی دھجیاں اڑ جائیں گی۔ اختیارات کو ذاتی، گروہی اور طبقاتی مفاد کے لیے استعمال کیا جانے لگے گا تو جمہوریت کے مقاصد پورے نہیں ہو پائیں گے۔ چنانچہ قابلِ عمل طریقہ یہ ہے کہ اختیارات کو ریاست کے مختلف شعبوں میں بانٹ دیا جائے اور دستور میں ہر ادارے کے حقوق و فرائض کی واضح نشان دہی کر دی جائے۔ عوام قانون ساز ادارے کے ارکان منتخب کرتے ہیں اور اکثریت رائے سے حکومت بھی تشکیل دیتے ہیں۔ حکومت پالیسی بناتی ہے اور انتظامیہ سے اس پر عمل درآمد کرواتی ہے۔ انتظامیہ کے ارکان طے شدہ طریقہ کار کے مطابق بھرتی کیے جاتے ہیں اور خاص عمر تک مستقل ملازمت میں رہتے ہیں۔ عدلیہ کا کام آئین کی روشنی میں قانون کی تشریح کرنا بھی ہے اور یہ دیکھنا بھی

---

(1) Democracy,encyclopaedia Britannica,William Benton,frederick 1970, p ۱۰

کہ حکومتی پالیسی آئین کے منافی نہ ہو۔عدلیہ کے ارکان کا انتخاب آئین میں طے شدہ طریقہ کار کے مطابق حکومت کرتی ہے۔اس طرح جمہوری نظام میں ریاست کے مختلف شعبوں میں اختیارات اور ذمہ داریوں کی تقسیم سے توازن پیدا کیا جاتا ہے۔[1]

۳۔ جمہور کی رائے کا احترام بشمول اقلیت کے لیے رائے دہی کا حق:

یہ بات بلکل عیاں ہے کہ سرکار کے اختیارات کم کرنے سے آزادی و خود مختاری بڑھ نہیں جاتی۔جس کی وجہ واضح ہے کہ مختلف طبقوں کی خواہشیں الگ الگ رہتی ہیں، جس سے انارگی پھیلتی ہے،انارگی سے یہ مراد لیا جاتا ہے کہ زورآوروں کے لیے آزادی اور ضعیفوں کے لیے غلامی، عام حالات میں مہذب سوسائٹی میں پائی جانے والی سماجی غلامی کہیں بدترین جسمانی غلامی میں تبدیل نہ ہو جائے جسے معیوب بھی نہ سمجھا جانے لگے۔اس لیے ہمیں یہ مسئلہ درپیش نہیں ہے کہ سرکار کے بنا کیسے نظام چلائیں بلکہ مسئلہ آزادی اور خود مختاری کا ہے کہ جس میں سرکار کی دخل اندازی نہ ہونے کے برابر ہو اور سرکار کے ہوتے ہوئے آزادی کے فوائد ثمرات کیسے حاصل کرنے ہیں۔یعنی کیسے سماجی اور جسمانی آزادی کے درمیان توازن پیدا کیا جائے۔جس معاشرے میں ایک طرح کا کریکٹر ہوتا ہے وہ معاشرہ مختلف کریکٹر رکھنے والے معاشرے سے آزادی کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ انسانوں اور جانوروں کی سوسائٹی میں آزادی پر قدغن ہی رہتی ہے۔کیوں کہ جانوروں کے معاشرے میں جانور پابند اور انسانوں کو بھی کئی طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہیں سفید چمڑی سیاہ چمڑی پر حاکم ہے تو اس کی آزادی ممکن نہیں اور کہیں آمرانہ سوچ کی یا آمر کی حکمرانی ہے تو انسان کی آزادی خطرے میں ہے۔انسان کی آزادی کو برقرار رکھنے کے تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔تاکہ وہ ایسی سرگرمیوں میں شامل ہو اور اس سے سیکھ سکے جو خوشیاں اسے میسر آرہی ہیں یہ باقی انسانوں کو بھی میسر ہوں نہ کہ ان سے سلب کر لی جائیں۔تربیت زندگی کے ابتدائی چھ برسوں میں نہایت خوش اسلوبی سے کی جاسکتی ہے جو کہ اس کا بہترین وقت ہے۔لیکن تربیت کو نظر انداز کر کے سب فریق اسے بھلا بیٹھے ہیں کہ تعلیم میں اہمیت کس چیز کو دی جانی چاہئے جب زندگی کے ابتدائی سال گزر جائیں جسے بچپنا کہتے ہیں اس کے بعد خواہشات پر کسی حد تک قابو پایا جاسکتا ہے مگر ان خواہشات کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان کو اس کے بچپنے میں ہی یہ سبق دیا جائے کہ انسان کی آزادی بلکہ خود انسان کی بقا اسی میں ہے کہ جیو اور جینے دو۔جس کسی معاشرے سے ایسی رکاوٹیں ختم ہو جاتی ہیں اس معاشرے میں لوگ نا صرف آزادانہ طریقے سے زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ حق رائے کی آزادی بھی نصیب ہو جاتی ہے نیز اقلیتوں کو اختلاف کرنے کا حق بھی میسر آجاتا ہے اسی لیے تو کہتے ہیں کہ جمہوریت کے اندر اگرچہ فیصلے اکثریت

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ، قطب الدین شاہ ولی اللہ، بیروت لبنان، ص ۲۳۵

رائے پر کیے جاتے ہیں اس کے باوجود اقلیتوں کو سرے سے پسِ پشت نہیں ڈال دیا جاتا بلکہ ان کی رائے اور اختلاف کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ اسی ضمن میں وجاہت مسعود لکھتے ہیں:

جمہوریت میں فیصلے اکثریتی رائے سے کیے جاتے ہیں لیکن اقلیت کے لیے اختلاف رائے رکھنے اور اس کا اظہار کرنے کا حق ختم نہیں ہوتا۔ اکثریتی رائے کا یہ مطلب نکالنا غلط ہے کہ اقلیتی رائے رکھنے والوں کو اکثریتی رائے اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ جمہوریت کا بنیادی اصول انسانی مساوات اور انفرادی رائے کی مساوی حیثیت ہے، اکثریت کے لیے ویٹو کا حق نہیں۔ (۱)

۴۔ قانون کی حکمرانی:

ایک مثالی ریاست کی تشکیل کے وقت چند چیزیں فرض کی جاتی ہیں کہ وہ ایک ایسی ریاست ہو گی جدہر قانون کی حکمرانی ہو گی، ریاست میں سبھی شہریوں سمیت اقلیتوں کو تمام بنیادی حقوق یکساں بنیادوں پر میسر ہوں گے، غربت، بھوک اور بیروزگاری جیسے ناموں سے عوام قطعاً نا آشنا ہوں گے، جہاں دہشت گردی کا ہولناک سایہ نہ لرزتا ہو گا، جہاں ماؤں کے قلب مطمئن ہوں گے، جہاں راوی امن سے سُکھ اور چین کی بانسری بجاتا ہو گا۔ لیکن اگر بد قسمتی سے ریاست میں ایسا کچھ بھی نہ ہو تو ہمیں ایک بار پھر نئے سرے سے سوچنا ہو گا کہ کیا واقعی وہاں قانون کی حکمرانی اور آئین کی بالادستی موجود ہے؟

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ہمارا موجودہ نظامِ عدل ہمیں نو آبادیات سے منتقل ہوا۔ اس سے قبل اگر دیکھا جائے تو برصغیر میں ہمیں شخصی نظامِ حکمرانی نظر آتا ہے جس میں اختیارات اور فیصلے نیز جزا و سزا کے احکامات بھی فردِ واحد کے ہاتھ میں محفوظ ہیں۔ جس نظام میں شہر کا قاضی بھی وقت کے حکمران کے سامنے سر جھکائے ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ جہاں عدل کے بلند و بالا ایوانوں میں انصاف کے تقاضوں سے مشروط تمام باتیں بیک جُنبشِ قلم مسترد کر دی جاتی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہم پر جو برطانوی راج مسلط کیا گیا تھا جو ایک نئی قانونی شکل کے ساتھ لایا گیا تھا لیکن ہمارے لیے وہ بھی قطعاً ایک بہترین نظامِ عدل نہ تھا۔ نو آبادیات کا تشکیل پانے والا قانون جو یہاں کے باشندوں کے لیے بغض اور تعصب سے مزین جب کہ ان کے اپنے لیے ہر گز قابل گرفت نہ تھا۔ ایک عام ہندوستانی سے روا رکھا جانے والا امتیازی اور تحقیر آمیز سلوک کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس کے بعد پاکستان کا قیام اور تب سے اب تک ایک جمہوری نظامِ حکومت تشکیل دینے کی سعی میں ہم نے بارہا عدلیہ کو اپنی آزادی کے لیے کئی دشوار ادوار سے گزرتے دیکھا۔

---

(۱) جمہوریت کیا ہے، وجاہت مسعود، ص:۳

اسلامی قانون کی طرح جمہوری قانون کے مطابق بھی ہر ایک انسان قانون کی نظر میں برابر ہے۔ اس حوالے سے یہ کہا جاتا ہے کہ تمام شہریوں کی برابری قائم کئے بغیر جمہوریت کامیاب ہی نہیں ہو سکتی۔ اسی ضمن میں وجاہت مسعود رقمطراز ہیں:

> "جمہوریت کا بنیادی تصور انسانی مساوات ہے۔ یہ اخلاقی اصول کہ تمام انسان رتبے اور حقوق کے اعتبار سے برابر ہیں۔ قانون ایک ایسا معاشرتی ادارہ ہے جس کا بنیادی مقصد افراد اور گروہوں کے باہمی تعلق، حقوق، اور فرائض کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کر کے انصاف فراہم کرنا" قانون "کا فرض ہے۔"(۱)

عدل و انصاف کے ابدی قوانین کا براہِ راست تعلق عوام کی ذاتی زندگی سے ہوتا ہے ۔ کسی بھی ریاست کی معیشیت تبھی مستحکم ہوتی ہے جب وہاں امن و امان قائم ہو ۔ اسی طرح جمہوریت کا استحکام بھی ریاست کی خوش حالی سے ہی مشروط ہے۔ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ قانون کی حکمرانی و بالادستی کی تلقین ریاستی عوام کے حوالے سے زیادہ کی جاتی ہے۔ جب کہ ملک کا ایک با اثر طبقہ، اشرافیہ یا جاگیر دار طبقہ خود کو اس سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے۔ ان کے لیے قانون ہاتھ میں لینا یا ریاست کے فعال اداروں کے اصول و ضوابط سے روگردانی کرنا ایک باعثِ افتخار امر ٹھہرتا ہے۔ اسی طرح جب ملک کے اعلیٰ ترین منصب دار قانون کو ایک من مانے سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے لگ جائیں تب بھی قانون کی بالادستی کا تصور ملیامیٹ ہونے لگتا ہے۔ کسی بھی معاشرے میں بگاڑ تبھی جنم لیتا ہے جب ریاست کا با اثر طبقہ یا جرائم پیشہ افراد محض حکام بالا تک اپنی رسائی کے زعم میں مبتلا ہو کر قانون کو ارزاں گردانتے ہیں اور اس کی بالادستی کو تسلیم نہ کرتے ہوئے سرکشی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بہت آسان اور سیدھی سی بات ہے کہ اگر ریاست کے مختلف اداروں کا نظام صرف درست، بروقت اور فعال ہو جائے تو عدل اور قانون کی بالادستی خود بخود قائم ہو جائے گی۔(۲)

۵۔ انسانوں کے بنیادی حقوق کا تحفظ:

حقوق لفظ جمع ہے حق کی جس کا معنیٰ یہ ہے کہ ایک ایسا مفاد ہے جو ریاست کی ذمہ داریوں میں شامل ہے کہ وہ محفوظ رہے ۔ حق و ضرورت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ہر انسان کو پیدائش سے چند بنیادی حقوق مل جاتے ہیں مثلاً زندگی جینے کا حق، زندگی کی بنیادی ضروریات کا حق مثلاً، کھانے کے لیے روٹی جس سے اس کی بھوک ختم ہو، پہننے

---

(۱) جمہوریت کیا ہے، وجاہت مسعود، ص:۶

(۲) ۱۲ نومبر ۲۰۱۶ کو ملتان میں لاہور ہائیکورٹ کی ڈیڑھ سو سالہ تقریبات کے سلسلہ میں منعقدہ کانفرنس میں پڑھا جانے والا مضمون: بعنوان، جمہوریت کیا ہے؟ وجاہت مسعود

کے لیے کپڑا جو موسم کی شدت سے اس کی حفاظت کر سکے، رہنے کے لیے مکان جس میں رہ سکے، تعلیم کا حق، صحت کا حق، آزادی رائے کا حق، معلومات لینے کا حق، مل جل کر بیٹھنے کا حق۔ انسانی حقوق کی تحریک میں ہر دور کے علماء، صوفیاء اور انقلابی رہنماؤں نے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے احتجاج میں آواز بلند کی ہے۔ اس تحریک کے باقاعدہ آغاز کا سراغ روم اور یونان سے ملتا ہے اور اس سلسلے میں ہمورابی کا قانون نہایت اہمیت کا حامل ہے جو حیات کے سارے پہلوؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔ پھر یہ تحریک کئی مراحل میں سے گزرتی ہوئی عالمی منشور پر آکر رکی جس نے اس تحریک کو باقاعدہ اور منظم شکل دی۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں کروڑوں جانوں کے نقصان کے بعد پوری دنیا کی قوموں نے ایک معاہدہ قبول کیا جس کی پہلی شق کے مطابق تمام انسان بلا تفریق رنگ و نسل برابر ہیں۔ اس معاہدے کو دنیا میں انسانی حقوق کے عالمی منشور (UDHR) کا نام دیا گیا۔ جو ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ کو منظور کیا گیا، اس کی ۳۰ شقیں ہیں جو انسانیت کو تمام بنیادی حقوق دینے کی ضامن ہیں۔ آج ۱۹۲ ممالک اس معاہدے کو قبول کرتے ہیں اور انسانوں کے حقوق کو متعارف کرانے میں کوشاں ہیں۔ انسانی حقوق کو لوگوں تک پہچانے کا طریقہ بھی خودکار سسٹم کی طرح ہونا چاہیئے۔ یعنی لگاتار، مسلسل چلنے والا سسٹم۔ شروع سے لے کر آخر تک تمام لوگوں کو ہر قسم کے حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ جیسا کہ ریاست ہم عوام سے ایک خودکار نظام کے تحت ٹیکس لیتی ہے مگر اسکے بدلے میں ہمیں وہ بنیادی حقوق سے محروم رکھتی ہے۔

۶۔ حقوق و فرائض میں مساوات

حقوق اور فرائض کا سلسلہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا اس زمین پر انسانی نسل پرانی ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ جب سے انسانی معاشرہ اس زمین پر قائم ہوا تب سے انسانی حقوق و فرائض کا آغاز ہو گیا تھا۔ مذہبی طور سے ہم یہ مانتے ہیں کہ موجودہ نسل انسانی آدم و حوا کی اولاد ہے۔ مائی حوا علیہا السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ کچھ ناسمجھ لوگ اس بنیاد پر عورتوں کو کمتر سمجھتے ہیں کہ اصل تخلیق آدم ہے اور حوا آدم سے ہی نکالی گئی ہے۔

آج کل حقوقِ انسانیت کا بہت زور ہے۔ ہر کوئی اس کے لیے کام کرنا چاہتا ہے۔ اس میں ذاتی حقوق سے لے کر ذاتیات تک کے حقوق شامل ہیں۔ زیادہ تر کے نزدیک انسانی حقوق سے مراد ان کے اپنے حقوق ہوتے ہیں جنہیں وہ ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے انسانی حقوق کے حصول کی خاطر بعض اوقات غیر انسانی حد تک حقوق بھی حاصل کر لیتے ہیں۔

ہر انسان کا دوسرے انسان پر حق ہے۔ یہ حق کسی بھی شکل میں ہو سکتا ہے۔ میاں بیوی، ماں باپ اور اولاد اور پڑوسی وہ بنیادی رشتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرہ بنتا ہے۔ بہن بھائی، دوست، یار سنت غیر مؤکدہ کی طرح ہیں جو ہوں تو بہت اچھا ہوتا ہے اگر نہ ہوں تو بھی ان کے بغیر زندگی کا سفر جاری رہتا ہے۔ البتہ ماں باپ کے بغیر زندگی بڑھ

نہیں سکتی اور اسی طرح اولاد کے بغیر نسل رک جاتی ہے۔ پڑوس بھی وہ تعلق ہے جس کا ہر ایک سے واسطہ پڑتا ہے کجا یہ کہ آپ ویران صحرا کے بیچوں بیچ سکونت اختیار کر لیں۔ اسی لیے اسلام میں بھی انہی رشتوں اور تعلقات کے سنوارنے پر بہت زور دیا گیا ہے۔

۷۔ عوام کی رائے:

جمہوریت عوام کی رائے سے قائم ہونے والی حکومت کا نام ہے۔ جمہوری نظام میں رائے عامہ بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ عوام کی رائے اسی صورت میں مناسب ہو سکتی ہے جب انہیں معلومات فراہم کی جائیں، انہیں مختلف نکتہ ہائے نگاہ تک رسائی حاصل کرنے کا موقع دیا جائے اور معاشرے میں موجود تمام افراد اور گروہوں کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ اپنی سمجھ اور علم کے مطابق لوگوں کو حالات و واقعات کی رفتار سے آگاہ رکھیں۔ اس سارے عمل کو رائے عامہ تشکیل دینے کا نام دیا جاتا ہے۔ اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن، جلسے جلوس، بحث ومباحثہ، سیمینارز، کتابیں، علمی مقالے اور اشتہارات وغیرہ، یہ سب رائے عامہ بنانے کے مختلف ذریعے ہیں۔ جمہوری معاشرہ ان ذرائع پر صرف اسی حد تک پابندی لگا سکتا ہے کہ اس حق کو استعمال کرتے ہوئے امن وامان برقرار رکھا جائے، تشدد سے کام نہ لیا جائے۔ سب کو اپنی رائے دینے کا حق ہے، اپنی بات زبردستی منوانے کا حق کسی کو نہیں۔[1]

۸۔ محاسبہ:

کسی بھی جمہوری ریاست میں بلاامتیاز احتساب جمہوریت کا حسن ہے۔ جمہوریت ذمہ دار اور جواب دہ حکومت کا نام ہے۔ عوام کی مرضی سے قائم ہونے والی حکومت اپنی کارکردگی اور افعال کے لیے عوام کے سامنے جواب دہ ہے۔ کیونکہ عوام اپنے سیاسی نمائندوں کو اختیارات کا لطف اٹھانے کے لیے نہیں بلکہ عوام کی خدمت کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ منتخب حکومت کا عوامی سطح پر احتساب عوام کا حق ہے اور خود کو احتساب کے لیے ہمہ وقت تیار رکھنا جمہوری حکومت کا فرض ہے۔

بلاامتیاز وبلا تفریق احتساب کا درس اسلام نے بھی دیا ہے، اسلام کے اسی حسن کو جمہوریت نے بھی قبول کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں اسلامیہ جمہوریہ پاکستان میں بھی احتساب ہو رہا ہے۔ احتساب کے عمل کو بہت سے لوگوں نے سراہا ہے اور یہ عمل سراہے جانے کے قابل بھی ہے۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ پاکستان میں احتساب جیسے عمل میں بھی جانبداری اور امتیازی سلوک برتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں

---

(۱) جمہوریت کیا ہے، وجاہت مسعود، ص:۱۸۔۱۹

نے اس نظام پر انگلیاں بھی اٹھائی ہیں۔لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ بلا امتیاز و بلا تفریق ہر کسی کا احتساب ہونا چاہئیے، تبھی معاشرہ متعدد قسم کی برائیوں سے پاک ہو گا اور عوام الناس سکھ کا سانس لیں گے۔

باب سوم:

اسلامی ریاست اور جمہوری ریاست کے اداروں کا جائزہ

فصل اول: اسلامی ریاست کے اداروں کا تعارف

فصل دوم: جمہوری ریاست کے اداروں کا تعارف

فصل سوم: اسلامی ریاستی اداروں کی امتیازی خصوصیات

فصل چہارم: جمہوری ریاستی اداروں کی خصوصیات

فصل اول:

اسلامی ریاست کے اداروں کا تعارف

اسلامی ریاست کے اداروں کا تعارف:

اسلام مکمل واکمل دین ہونے ساتھ ساتھ انسانوں کے لیے ایک مکمل دستورِ زندگی بھی ہے۔ اسلام جہاں انفرادی طور پر فرد کی اصلاح پر زور دیتا ہے وہیں اجتماعی زندگی کے زریں اصول وضع کرتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں انسانیت کی راہ نمائی کرتے ہیں۔

اسلامی نظام پر مبنی ریاست میں ریاست کے امور سرانجام دینے کے لیے اداروں کا تعین نہیں کیا گیا کہ فلاں فلاں اداروں کا ہونا لازمی ہے۔ بلکہ حکام اپنی ریاست کی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جو ادارہ مناسب سمجھیں اس کا قیام عمل میں لاسکتے ہیں۔ عہد نبوی اور عہد خلفاء راشدین اور ان کے بعد آنے والے خلفاء یا اسلامی حکمرانوں کے ادوار کا مطالعہ کرنے سے اسلامی ریاست میں مندرجہ ذیل ادارے ملتے ہیں۔

۱۔ مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ)

اسلامی ریاست میں شوریٰ ایک بنیادی عنصر ہے جس کے بغیر اسلامی ریاست کا تصور ممکن نہیں جس طرح قرآنِ کریم میں اللہ کا فرمان ہے۔

﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾[1]

۲۔ مالیات (بیت المال)

مالیات کا شعبہ بڑا اہم ہے۔

۳۔ محصولات (زکوٰۃ، عشر، جزیہ)

ریاست کے محصولات ہوتے ہیں جن کی وصولی سے ریاست کے معاملات چلتے ہیں۔

۴۔ عدالتوں کا قیام

ایسی عدالتیں جہاں عوام / رعایا کو انصاف ملے ایسی عدالتوں کا قیام ریاست کی بقا کی ضامن ہوتی ہیں۔

۵۔ مواصلات (سڑکیں، ڈاکخانہ وغیرہ)

سڑکیں اور رابطہ کے نظام سے ریاستیں ترقی کرتی ہیں۔ آمدورفت اور رابطہ سڑکوں کے مستقل نظام کے بغیر ممکن نہیں۔

---

(۱) سورۃ الشوریٰ: ۴۲/ ۳۸

۶۔ دفاعی نظام (بحری، بری، فضائی فوج اور پولیس)

ریاست کی بقا اور حفاظت کے لیے دفاع کا نظام لازمی امر ہے۔

۷۔ خارجہ امور کا محکمہ (ایلچی اور سفراء کا نظام)

دوسرے ممالک کے ساتھ روابط اور تعلقات اسی محکمے کے تحت آتے ہیں۔

۸۔ گورنرز کا تقرر

گورنرز کا تقرر وہ بھی اہلیت کی بنیاد پر کیوں کہ خلیفہ یا حاکم ہر جگہ تو پہنچ نہیں سکتے اس لیے ایسے گورنرز کا تقرر جو کہ خلیفہ / حاکم کے نمائندے ہوتے ہیں۔

۹۔ اہل مشیروں کا تقرر

مجلسِ شوریٰ یہ مخصوص لوگ جو خلیفہ / حاکم کے خاص طور پر مشیر رکھے جاتے ہیں جو مختلف امور مملکت میں تجربہ اور مہارت رکھتے ہیں جو حقیقتاً اس بات کے اہل ہوتے ہیں کہ حاکم یا خلیفہ ان سے مشورہ کر سکے۔

۱۰۔ تفقہ فی الدین کا خصوصی ادارہ

ایسا ادارہ جو جدید دور، مشکل مسائل کے حل کے لیے امت کی راہنمائی کرے قرآن و سنت سے ان کا حل نکالیں۔

ان اداروں کو اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو یہ ادارے ریاست کے بنیادی اداروں کے ضمن میں آجاتے ہیں لہٰذا ریاست کے بنیادی اداروں کو موضوعِ بحث لاتے ہیں جس سے مندرجہ بالا اداروں کے ساتھ ساتھ ریاست کے بنیادی ادارے واضح ہو جائیں گے۔

اسلامی ریاست کے بنیادی ادارے:

کسی بھی ریاست کے بنیادی ادارے یہی تین ہیں بلکہ آج کل کی مہذب ترین ریاستوں کی بنیاد بھی انہی اداروں پر ہے اس لیے اسلامی ریاست کی بنیاد بھی ان تین اداروں کو بنایا ہے اور ان کو بنیادی اداروں کا نام دیا ہے۔ باقی کے تمام ادارے بنیادی طور پر درج ذیل تین اداروں کے ضمن میں آجاتے ہیں۔

۱۔ عدلیہ

۲۔ مقننہ

۳۔ انتظامیہ

ا۔عدلیہ

اسلامی ریاست کا اہم ادارہ عدالت و انصاف کا ادارہ ہے۔ جس کا قیام انصاف کے بنیادی اصولوں پر رکھا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾[1]

ترجمہ: البتہ تحقیق بھیجا ہم نے اپنے پیغمبروں کو واضح نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ اور نازل کی ساتھ ان کے کتاب اور ترازو تا کہ قائم ہوں لوگ انصاف پر۔

اس آیت میں ظاہر ہے کہ اسلام میں ریاست و حکومت کا مقصد اقامتِ دین ہے۔ کتاب و سنت کے مطابق انصاف و مساوات قائم کرنا، نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا ہے۔ ان اوصاف سے مزین ایک مثالی معاشرے کا قیام اور حفاظت ہے۔ یہ ریاست ایک مقصدی ریاست ہے اور اس کی ذمہ داری اس اصول کی سربلندی ہے جس کے لیے یہ قائم ہوتی ہے اور اس اصول کی داعی ہے جو تمام انسانوں کے لیے یکساں ہے۔ زمین کے کسی بھی گوشے میں نسلِ انسانی کے بسنے والے جو افراد بھی چاہیں اس کو اختیار کر سکتے ہیں اور کسی امتیاز و تعصب کے بغیر مساوی حقوق کے ساتھ اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔

اسی ضمن میں ارشادِ نبوی ہے:

((رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ، أَنَا شَهِيدٌ أَنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ إِخْوَةٌ))[2]

ترجمہ: ہمارا رب ہر چیز کا رب ہے، میں گواہ ہوں بے شک سارے بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ حاکم و محکوم، صاحبِ امر اور مامور میں اسلامی قانون کی تنفیذ کے حوالے سے کوئی فرق نہیں کرتا۔ قانون سب کے لیے ایک ہے اور سب پر یکساں نافذ ہوتا ہے۔

اسلام میں برتری کا معیار:

خوفِ خدا، نیک عمل اور اچھا اخلاق اسلامی معاشرے میں برتری کا معیار ہے، نہ کہ تخت و تاراج، بلند رتبہ اور سماجی حیثیت۔ اللہ رب العزت کا فرمان ہے کہ:

---

(۱) سورۃ الحدید: ۵۷/۲۵

(۲) صحیح ابن حبان، ابو حاتم محمد بن حبان، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۳ء، ۱۱/۲۱۷

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا ----------﴾[1]

ترجمہ:اے لوگو!حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تم سب کوایک مرداور ایک عورت سے پیدا کیا،اور تمہیں مختلف قوموں اور خاندانوں میں اس لیے تقسیم کیاہے تاکہ تم ایک دوسرے کی پہچان کر سکو۔ درحقیقت اللہ کے ہاں تم میں سب سے زیادہ عزت والاوہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔یقین رکھو کہ اللہ سب کچھ جاننے والا،ہر چیز سے باخبر ہے ۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ:

((لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ، وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ، وَلَا أَحْمَرَعَلَى أَسْوَدَ، وَلَا أَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ، إِلَّا بِالتَّقْوَىٰ------))[2]

ترجمہ:کوئی فضیلت نہیں اہل عرب کے لیے کسی عجم والے پر اور نہ ہی فضیلت ہے عجمی کے لیے اہل عرب پر اور نہیں گورے (سفید) رنگ والے کو سیاہ رنگ والے پر،نہ ہی کالے کو گورے پر سوائے تقویٰ کے۔

اسلامی ریاست کی بنیادی انفرادیت اور خصوصیت ہے کہ یہ اصولی اور نظریاتی ریاست ہے، جو رنگ و نسل، زبان و وطن،جغرافیائی یا قبائلی عصبیتوں کے بجائے صرف اصول اور اسلامی نظریہ حیات کی بنیاد پر قائم ہوتی ہےاور اسی نظریے کی علمدار اور اس کی تابع ووفادار ہوتی ہے۔آزادانہ طور پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کااقرار کرنے والی،خلافت کی حیثیت قبول کرنے والی اوراس کے قانون کے نفاذ کی ذمہ داراورا ن ہدایات واحکام کے مطابق کام کرنے کی پابند رہتی ہے جن کو اللہ نے اپنے رسول ﷺ کے توسط سے عطاء کی ہیں۔یہ ریاست نظریہ اور اصول کی داعی ہوتی ہے۔

اس ضمن میں فرمانِ خداوندی ہے کہ:

﴿الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾[3]

---

(۱)سورۃ الحجرات: ۴۹/۱۳

(۲) صحیح جامع للالبانی،الشیخ محمد ناصر الالبانی،ناشر الدعوۃ اکیڈمی،اسلام آباد پاکستان،ص:۳۲۴

(۳)سورۃ الحج : ۲۲/۴۱

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پاؤں جمادیں (بااختیار بنادیں) تو یہ پوری پابندی سے نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ دیں، اور اچھے کاموں کا حکم کریں اور برے کاموں سے منع کریں، تمام کاموں کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔

۲۔ مقننہ (پارلیمان):

مقننہ کو اسلامی اصطلاح میں مجلس شوریٰ کہا جاتا ہے۔ اسلامی ریاست کی اہم انفرادیت وخصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک شورائی نظام کی حامل ریاست ہے، اس میں مساوات ہیں، حسب ونسب، قوم وملت کی وجہ سے کوئی، کسی پر برتر نہیں ہے۔ وحدت اور مساوات وحریت کے بنیادی اصول ہیں۔ اربابِ اختیار تمام امور سلطنت باہم مشاورت سے طے کرتے ہیں۔ اور نظام حکومت کو جمہور کی مرضی سے چلاتے ہیں۔ ساری رعایا کی بنیادی ڈیوٹیاں وفرائض اور حقوق مقرر ہیں جو کہ حاکمِ وقت قانون شریعت کے مطابق رعایا سے ان کے ذمے کا کام لینے کا پابند ہے جس کی اجرت بھی رعایا کو دی جاتی ہے۔ اسلام کی تعلیمات پر مبنی حکومت مزاجاً نہ آمرانہ ہے اور نہ ہی اس کا مزاج بادشاہت ہے بلکہ اس کا میلان خالص جمہوریت اور شورائیت کی طرف ہے۔

اسلامی نظام سیاست میں مشاورت کو اہم مقام حاصل ہے یہ بات پہلے بھی کر چکے ہیں کہ اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ قرآن کریم کی مکمل سورۃ کو الشوریٰ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اسلامی ریاست میں شورائی نظام کا ایک خاص مقام ہے۔

اس لیے ماہرین قانون نے یہ کہا ہے کہ شوریٰ اسلامی نظام کی روح اور لازمی جزو ہے۔ اسی ضمن میں ابن عطیہ رقمطراز ہیں:

"الشوری من قواعد الشریعة وعزائم الاحکام ومن لایستشیر اهل العلم والدین فعز له واجب لا اختلاف فیه"[1]

ترجمہ: شوریٰ شریعت کے قواعد میں سے ہے اور احکام کے امور میں سے ہے اور جو مشورہ نہیں کرتے تو ان کا ہٹانا لازم ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے

رسول اللہ ﷺ پر براہِ راست اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی تھی اس لیے کسی دوسرے سے مشورے کی چنداں ضرورت نہیں تھی لیکن چونکہ آپ ﷺ ایک آئیڈیل سوسائٹی کی بنیاد فرما رہے تھے۔ نبی کریم ﷺ کی ایک ایک بات قیامت تک آنے والی انسانیت کی راہنمائی کا سبب بننی تھی۔ مسلمانوں کے انفرادی واجتماعی قانون کی عملی بنیادیں تشکیل پا رہی تھیں، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے سربراہ مملکت کے طور پر دیگر اجتماعی اصولوں کی عملی

(۱) المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز، ابن عطیہ اندلسی، واحد تبریز، دانشگاہ آزاد اسلامی، تبریز، ایران، ص: ۲۱۷

وضاحت کے ساتھ ساتھ ایک مثالی شوریٰ کے تمام تقاضوں کو پورا کیا۔ آپ ﷺ مشورہ کرتے وقت شرکاء کو مکمل اظہارِ رائے کی آزادی دیا کرتے اور تند و تعبیر کی اجازت بھی مرحمت فرماتے۔ نبی کریم ﷺ شوریٰ کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ اس کے فیصلے کے نفاذ میں اپنی ذاتی خواہش تک کو بھی نظر انداز فرمادیا کرتے تھے ۔

اسی لیے رسول ﷺ کی حیات طیبہ میں بالخصوص مدنی عہد میں شوریٰ کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ کیونکہ اس دوران ایک نظام ریاست تشکیل پا رہا تھا جو قیامت تک آنے والی انسانیت کے لیے راہنمائی کا سرچشمہ بننا تھا۔ شوریٰ کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کا معمول ہوا کرتا تھا کہ جو فیصلہ شوریٰ کے اندر طے پاجاتا پھر اس کی لازمی پابندی کی جاتی تھی۔ زمانہ نبوی کے بعد زمانہ خلفائے راشدین کے اندر بھی شورائی نظام کو اپنایا گیا اور جدید پیش آنے والے مسائل کا حل شوریٰ کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ کیونکہ خلفائے راشدین کے سامنے قرآنی آیات کی اور فرمانِ نبوی واضح ہدایات موجود تھیں کہ وہ کس بنیاد پر اس سیاسی نظام کو قائم کریں۔ چنانچہ خلفائے راشدین کے اپنے انتخاب سے لے کر حکومت و ریاست کے تمام معاملات میں شورائی نظام کو تسلسل اور اہتمام کے ساتھ قائم رکھا گیا۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"یعنی خلافت وہ ہے جس کو قائم کرنے میں مشورہ کیا گیا ہو اور بادشاہی وہ ہے جس پر تلوار کے ذریعے غلبہ حاصل کیا گیا ہو۔"(۱)

خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت کے دوران فرمایا:

"فَإِذَا رَأَيتُمُونِي قَد استَقَمتُ فَاتَّبِعُونِي وَإِن زَغتُ فَقُومُونِي "(۲)

ترجمہ: جب تم مجھے دیکھو کہ میں سیدھے راستے پر چل رہا ہوں تو میری اتباع کرنا اور اگر میں راہِ راست سے ہٹ جاؤں تو مجھے ٹھیک کر دو۔

یہی طریقہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا بھی رہا، آپ رضی اللہ عنہ کا فرمان مشہور ہے کہ:

"لَا خَلَافَةَ اِلَّا عَن مَّشوَرَةٍ"(۳)

ترجمہ: مشورے کے بغیر خلافت نہیں ہے۔

---

(۱) طبقات کبری، ابن سعد، ۱۱۳/۴

(۲) صحیح بخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل، بخاری، الادب المفرد، ص: ۵۳

(۳) کنز العمال، علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین الہندی، مکتبۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۵ء، ۱۳۴۱۳۹/۴

عہد خلافت میں شوریٰ کے اہم اجلاسوں کا تذکرہ کتبِ تاریخ میں موجود ہے۔ خلفائے اربعہ کے انتخاب کی مختلف سورتوں کے علاوہ شوریٰ برائے لشکرِ اسامہ، شوریٰ برائے منکرینِ زکوٰۃ اور معاہدہ بیت المقدس کے حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شوریٰ وغیرہ اس سلسلے کی اہم مثالیں ہیں۔

اسلامی نظام حکومت کے اس بنیادی اصول کی امتیازی حیثیت ہے کہ تہذیبی دائرے میں رہتے ہوئے اور اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر کسی کو اختلاف و تنقید کا حق حاصل ہے۔ لیکن باہمی مشاورت کے بعد اجتماعی فیصلے کی تنفیذ میں کسی فریق کو خلل ڈالنے یا رکاوٹ بننے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی تاریخ میں بارہا ایسا دیکھا گیا ہے کہ شوریٰ کی طرف سے اجتماعی فیصلہ آجانے کے بعد اجتماعی فیصلہ سے اختلاف رکھنے والے نہ صرف اس اجتماعی فیصلہ کو مانتے تھے بلکہ دل و جان سے اس پر عمل در آمد کرنے میں سب سے پہلے اپنا کردار ادا کرتے تھے۔ اس کی مثال عہدِ صدیقی میں منکرین زکوٰۃ کے خلاف جنگ کرنے سے اختلاف کرنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے شوریٰ کی جانب سے اجتماعی فیصلہ آنے کے بعد نہ یہ کہ اسے قبول کیا بلکہ اسی فیصلے پر سب سے پہلے عمل کیا اور اس کے نفاذ کے سلسلے میں اپنی جان و مال کی قربانیاں پیش کیں۔ یہ صرف ایک مثال نہیں بلکہ عہدِ نبوی اور عہد خلفائے راشدین میں شورائیت کی بنیادی روح یہی تھی۔ اس لیے اسلامی نظامِ حکومت و خلافت جب قائم ہو گا، یہ اصولِ شورائیت اپنی اسی روح کے ساتھ کامیاب نظام کی بنیاد بن سکے گا۔ عہدِ نبوی اور خلفائے راشدین کی سنت کا یہی اصولِ شوریٰ آج کی جمہوریت کی ناکامیوں کا موثر معالج ہے۔

اسلام نے شوریٰ کی باقاعدہ ایک مخصوص شکل بتانے کی بجائے اس کا تعین زمانے اور علاقائی حالات کے ساتھ مربوط کیا ہے۔ یہ اسلامی شریعت کی خصوصیت ہے جو اس کی خاصیت اور عالمگیریت کو واضح کرتی ہے کہ یہ قانون دنیا کے کسی بھی کونے میں قابلِ عمل ہے۔

اسلامی ریاست کا شورائی پہلو اس کی خصوصیت و انفرادیت ہے۔ عہد نبوی اور عہد خلفائے راشدین میں شوریٰ سمیت ریاست کے تمام بنیادی اصولوں کو ان کی روح کے مطابق قائم کیا گیا جو عصرِ حاضر میں بھی اسلامی ریاست کی اساس ہے۔

۳۔ انتظامیہ:

کسی بھی ریاست میں انتظامیہ کا کردار اہم اور بنیادی مانا جاتا ہے۔ انتظامیہ دوسرے الفاظ میں حکومت کو کہا جاتا ہے انتظامیہ کا سربراہ خلیفہ / حاکم ہوتا ہے جب کہ وزیر اپنے اداروں کے سربراہ کی حیثیت میں کام کرتے ہیں۔ یہ سب خلیفہ / حاکم کو جواب دہ ہوتے ہیں ملک کا نظام چلانا انتظامیہ کے فرائض میں شامل ہے ۔ مرکزی، قومی یا

وفاقی حکومت ملک کے اداروں کا دوسرے ممالک سے لین دین کی ذمہ دار اور ضامن ہوتی ہے۔ دوسرے ممالک سے معاہدے مرکزی حکومت کرتی ہے۔ عوام کی فلاح وبہبود کے لیے پالیسی بنانا مرکزی حکومت ذمہ داری ہے۔

سربراہِ ریاست کا انتظامیہ میں کردار:

اسلامی مملکت کا سربراہ مملکت کے نظم و نسق کو قانون شریعت کے مطابق چلانے کا ذمہ دار ، ملت کے مفاد اور مصالح کا نگران و محافظ ہے۔اسلامی مملکت کا حکمران اس اقتدار کا اصل امین یعنی امت کا اجیر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اس اقتدار کا بالواسطہ امین ہوتا ہے۔جو امت نے اسے بطور امانت سپرد کر دیا ہے اور جس کے تقاضوں کی تکمیل کا ذمہ ملت اور قوم کا نمائندہ بننے کے سبب اس کی بنتی ہے صاف ظاہر ہے کہ یہ سربراہ مملکت کی ذمہ داری ہے کیونکہ اللہ نے اپنے کلام کی جس آیت میں اجرت اور مزدور کی بات کا ذکر کیا ہے اس آیت سے تمام مفسرین کرام اورفقہائے اسلام نے مملکتی ذمہ داریاں بھی مراد لی ہیں۔ چنانچہ سورہ قصص کی آیت:

﴿إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ﴾[1]

ترجمہ: بے شک یہ بہترین اجیر، قوی اورامانت دار ہے

یعنی بہترین اجیر جس کو تم اجرت پر رکھووہ ہے جو جسمانی لحاظ سے قوی اور مزاج کے لحاظ سے امین ہواس سے تمام مفسرین کرام نے حکمرانوں کی ضروری صفات پر استدلال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دور صحابہ سے تاحال فقہائے امت حکمرانی کے لیے ان دو صفات کو ضروری قرار دیتے چلے آ رہے ہیں۔ اس آیت میں اس اہم تصور کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ امت آجر ہے اور حکمران اجیر ہے۔

اسلامی مملکت کا سربرا ہ امور مملکت میں جو کچھ تصرف کرتا ہے وہ امت کے دیئے ہوئے اختیار کی بنا پر کرتا ہے، امت اس کی پشت پر رہتی ہے ، تاکہ سربراہ مملکت کی اطاعت کے ساتھ سربراہِ مملکت کی نگرا نی بھی ہوتی رہے۔جہاں ضروری ہو اس کی مدد بھی کرے۔ اگر وہ شریعت کی مقرر کر دہ حدود سے تجاوز کرنے لگے تو اسے روکے بھی ، اور اگر ناگزیر ہوتو اس کو معزول بھی کر دے۔اس لیے کہ قرآن و سنت میں خلیفہ و امت دونوں ہی کو ان حکموں کا یکساں طور پر ذمہ دار بنایا ہے جو شریعت الٰہی کومطلوب و مقصود ہیں۔ مسلم مفکرین نے سربراہ مملکت کے جن اختیارات و ذمہ داریوں کی وضاحت کی ہے ذیل میں بیان کی جاتی ہیں:

---

(۱)سورۃالقصص:۲۸/۲۶

۱۔ نظمِ حکومت میں قانون شریعت کا کامل نفاذ ،حق و انصاف کی بنیاد پر نظم حکومت قائم کرنا اور مستحکم کرنا ، فرائض کی ادائیگی کا اہتمام کرنا، حدود کا قیام ، معاشرے میں امر باالمعروف و نہی عن المنکر کے نظام کا اجراء ، عدل اجتماعی اور امن عامہ کا قیام اور فساد و شر کا انسداد سربراہ مملکت کی ذمہ داریوں میں شامل ہیں۔

۲۔ سربراہ مملکت وخلیفہ دین کا محافظ ہے اور حفاظت دین اس کی بنیادی ذمہ داری ہے ، کیونکہ ریاستِ اسلامی کو قائم کرنے کا بنیادی مقصدہی دین کو محفوظ بنانا اوراس کا نافذ کرنا ہے۔لہذا امام اس ذمہ داری کا امین ہے۔ اس فرض کی ادائیگی ایسے ہو کہ مذہب کی قوت کمزور نہ ہونے دی جائے تاکہ امت کا شیرازہ مجتمع رہے اور امت زوال پذیر نہ ہونے پائے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک امت کو مجتمع رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ امت اور ریاست کے اساسی نظریہ دین اور مذہب سے وابستگی کو مضبوط رکھا جائے جب تک ایسا رہے گاتو امت کی قوت مجتمع رہے گی۔

ان کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پہ انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری
دیں دامن سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی (۱)

دین سے وابستگی اگر مضبوط رہے گی تو امت کی اجتماعیت مجتمع رہے گی ۔ اس سے ریاست و حکومت مضبوط و مستحکم ہو گی۔ کیونکہ دین بنیادی اساس ہے جو اسلامی اجتماعیت ، ملت و ریاست کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اگر دین کا دامن ہاتھ سے چھوٹے گا تو امت کی اجتماعیت کا شیرازہ بکھر جائے گا اور اگر امت منتشر ہو گی تو پھر ملت و ریاست کا وجود بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ سربراہ مملکت بہترین اجتماعیت کی تشکیل کے لیے تربیتی نظام قائم کرے۔ معاشرے میں لوگوں کی کردار سازی کے ذریعے بہترین افراد معاشرہ تیار کیے جائیں جو ہر دور میں امت اور ملت کو مقاصد سے ہم آہنگ رکھیں اور ملت کو مجتمع رکھنے کا فریضہ سر انجام دیں۔

۳۔ سربراہ مملکت کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ ریاست اور اس کے سیاسی نظام کو مضبوط اور مستحکم رکھے۔اسلامی مملکت کا سیاسی نظم بھی اسی دینی نظریے پہ قائم ہوتا ہے۔ اسی لیے ریاست

---

(۱)ضربِ کلیم،علامہ محمد اقبال، مکتبہ اویسیہ اردو بازار،لاہور،۱۹۹۳ء/۱۱

میں سیاسی استحکام بھی اس بنیادی نظریے سے مضبوط وابستگی ہی کی بدولت قائم رہ سکتا ہے۔ ابن خلدون کی رائے میں اسلامی ریاست کا ہر فرد اس نظم کے ماتحت اپنی خوشی سے رہتا ہے اور اپنی اجتماعی قوت کو امیر کے ہاتھ میں دیتا ہے تاکہ سیاسی نظم اپنی پوری طاقت اور مکمل اختیار کے ساتھ قائم اور باقی رہے، حقوق عامہ کی نگہداشت ، سوسائٹی کے اختلافات کی اصلاح ، ظلم و زیادتی کا ازالہ امام کی سیاسی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

۴۔ مملکت میں امور عامہ تمام انتظامی معاملات جن کا تعلق فرد اور معاشرہ سے ہے ان سب پر امام اور سربراہ مملکت کا اختیار کار فرما ہے۔ ریاست کے تمام ادارے اس کی راہنمائی کے ماتحت ہیں۔ الماوردی کے نزدیک صوبوں کی تشکیل ، حکام صوبہ جات کا تقرر و عزل ،عدلیہ کے اعلیٰ حکام اور قاضی (ججز) کی نامزدگی ، مالیات و اقتصادیات کی نگرانی مختلف منصوبوں کے لیے فنڈز کی حتمی منظوری سرحدوں کی حفاظت ،افواج کی تنظیم اور دفاعی انتظامات کے علاوہ عوام کے مساوی حقوق کی نگہداشت کمزور اور طاقت ور کے درمیان توازن کی دیکھ بھال ، بیرونی خطرات کے وقت فوج کو لشکر کشی کا حتمی حکم جاری کرنا ، ان سارے امور کا سربراہ مملکت کو اختیار حاصل ہے۔ جن میں سے ہر اختیار کو فرض اور امانت سمجھ کر استعمال کیا جاتا ہے۔

فارابی نے تجویز کیا ہے کہ رئیس مملکت (جسے وہ رئیس اول کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں) عوام الناس کی استعداد کو دیکھ کر ان کو ریاست کے مختلف عہدوں پہ فائز کرے۔ اگر تمام عہدے اہل افراد کے ذریعے پُر کیے جائیں تو ہم حکومت کو منظم کہہ سکتے ہیں ورنہ نہیں۔

فارابی نے حکومت کی مشینری کو انسانی جسم سے تشبیہ دی ہے جس میں رئیس مملکت کو قلب(دل) کہتے ہیں جبکہ دیگر اعضائے جسم ریاستی حکام و عہدہداروں کی حیثیت رکھتےہیں ۔جیسے قلب انسانی جسم میں تمام حصوں کے امور متعین کرتا ہے اسی طرح رئیس مملکت تمام ریاستی اداروں اور حکام کے کام اور ذمہ داریوں کا تعین کرتا ہے اور ان کا نگران بھی ہے۔ظاہر ہے کہ اگر رئیس مملکت غیر فعالیت کا مظاہر کرے گا تو پورا نظام غیر فعال ہوکے رہ جائے گا۔[1]

اگر چہ یہ تمام امور براہ راست سربراہِ مملکت خود انجام نہیں دے سکتا بلکہ اس کے لیے وہ مختلف حکام و معاونین کا تقرر کرتا ہے لیکن بطور سربراہ مملکت ، ریاست کے تمام دینی ، سیاسی اور انتظامی امور کا ذمہ

---

(۱)اراءاہل المدینہ الفاضلہ، محمد بن ترخان ابو نصر فارابی،بیروت،۱۹۷۳ء/۱۱

دار بہرحال سربراہ مملکت ہی ہے اور وہی امت کے سامنے بھی اور اللہ کے سامنے بھی امانت کے امین کی حیثیت سے جوابدہ ہے۔

فصل دوم:

جمہوری ریاست کے اداروں کا تعارف

جمہوری ریاست کے اداروں کا تعارف:

جمہوری ریاست سے میری مراد اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ذیل میں اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کے اداروں کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے جو کہ آئینِ پاکستان یا دستورِ پاکستان سے ماخوذ ہے۔ دستور کسی ریاست اور معاشرے میں بنیادی قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کے تمام ہی دساتیر اس امر پر شاہد ہیں کہ وہ ریاست کے مقاصد اور نظامِ حکومت کے بنیادی ڈھانچے کی حفاظت کے ضامن ہوتے ہیں۔ چونکہ اس کے ساتھ وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگی کی ضرورت بار بار رونما ہوتی ہے، اس لیے ریاستی دساتیر ایک زندہ دستاویز کے طور پر ان ضرورتوں کی تشفی کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔

آئین کے آرٹیکل نمبر ۱ کے مطابق پاکستان ایک فیڈرل جمہوریت کا حامل ملک ہو گا اور اس کا نام اسلامیہ جمہوریہ پاکستان ہو گا۔[1]

جس طرح پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ کسی بھی ریاست کے بنیادی ادارے تین ہیں ایسے ہی پاکستان جو کہ اسلامی جمہوری نظام کی حامل ریاست ہے اس کی بنیاد بھی درج ذیل اداروں پر ہے جنہیں ریاست کے ستون بھی کہا جاتا ہے۔

۱۔عدلیہ ۲۔مقننہ ۳۔انتظامیہ

۱۔عدلیہ

عدلیہ کے سربراہ کو چیف جسٹس کہا جاتا ہے یعنی قاضی القضاء۔عدلیہ یا قاضیت ایک نظامِ قانون ہے جو دنیا کے تمام ممالک میں رائج ہے۔ عدلیہ وہ نظام ہے جو عدل یعنی انصاف دیتا ہے۔ جو عدل یا انصاف کرتا ہے اسے قاضی، عادل، منصف یا جج کہا جاتا ہے اور جہاں انصاف یا عدل کیا جاتا ہے اس جگہ کو عدالت یا کورٹ کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہاں عدلیہ کے سربراہ کی بات کرنی مقصود ہے اور عدلیہ کی سب سے بڑی عدالت عدالتِ عظمیٰ کہلاتی ہے اس لیے ذیل میں اسی عدالتِ عظمیٰ کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے۔

عدالت عظمیٰ:

عدالت عظمیٰ (سپریم کورٹ) پاکستان کی سب سے بڑی عدالت ہے۔ ۱۹۷۳ کے آئین کے حصہ ۷ کے مطابق اس کی مجودہ تشکیل ہوئی ہے۔

---

(۱) اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، محمد ریاض معتمد قومی اسمبلی، ۷ جنوری ۲۰۱۵، اسلام آباد، آرٹیکل ۱، ص ۳

سپریم کورٹ میں ایک چیف جج ۱۷ ججز، ۲ ایڈہاک ججز ہوتے ہیں جو صدرِ پاکستان اور وزیرِ اعظم پاکستان کے مقرر کردہ نمائندوں کی منظوری سے نامزد ہوتے ہیں۔

عدالتِ عظمیٰ کی آئینی تشکیل :

موجودہ عدالت عظمیٰ کی تشکیل ۱۹۷۳ء آئین پاکستان کے حصہ ۷ کی شق ۱۷۶ سے ۱۹۱ سے ہوئی ہے ان شقوں میں عدالت عظمیٰ کے اختیارات، نامزدگی، ذمہ داریاں اور قواعد بیان کئے گئے ہیں۔

آرٹیکل ۱۷۶ سپریم کورٹ کی تشکیل کو بیان کرتا ہے۔

آرٹیکل ۱۷۷ عدالت عظمیٰ کے جج صاحبان کا تعین کس طرح کیا جائے اس کو بیان کرتا ہے۔

عدالت عظمیٰ کے ذیلی دفتر :

عدالت عظمیٰ کے پانچ دفتر ہیں ۔[1]

۱۔ اسلام آباد جہاں مرکزی دفتر یعنی سپریم کورٹ آف پاکستان کی شاندار عمارت موجود ہے۔

۲۔ جب کہ ایک ذیلی دفتر پشاور میں ہے جو کہ صوبہ خیبر پختونخواہ کا دارالحکومت ہے۔

۳۔ جب کہ ایک ذیلی دفتر لاہور میں ہے جو کہ صوبہ پنجاب کا دارالحکومت ہے۔

۴۔ جب کہ ایک ذیلی دفتر کراچی میں ہے جو کہ صوبہ سندھ کا دارالحکومت ہے۔

۵۔ جب کہ ایک ذیلی دفتر کوئٹہ میں ہے جو کہ صوبہ بلوچستان کا دارالحکومت ہے۔

عدالت عظمیٰ کی ذیلی عدالتیں:

عدالت عظمیٰ کی ذیلی یا ماتحت عدالتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

عدالتِ عالیہ ہائی کورٹ۔

سیشن کورٹ۔

سول کورٹ / مجسٹریٹ۔

سیشن کورٹ ضلعی سطح کی عدالت کو کہا جاتا ہے جب کہ ہائی کورٹ صوبائی سطح کی عدالت کو کہا جاتا ہے اور ان سب کے اوپر سپریم کورٹ یا عدالتِ عظمیٰ مرکزی سطح کی عدالت کو کہا جاتا ہے۔

---

(۱) اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، محمد ریاض معتمد قومی اسمبلی، ۷ جنوری ۲۰۱۵، اسلام آباد، آرٹیکل ۱، ص ۳

۲۔ مقننہ (پارلیمنٹ)

مقننہ وہ جماعت یا مجلس ہوتی ہے جو قوانین کو بناتی ہے، اس میں ترامیم کرتی ہے یا قانون کو ختم کر سکتی ہے۔ مقننہ کے پاس بہت سے اختیارات ہوتے ہیں جن کو بروئے کار لا کر یہ قانون سازی کرتی ہے۔ پاکستان میں مقننہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ مقننہ سے مراد قانون ساز ادارہ ہے جو کہ درج ذیل ذیلی اداروں کے ذریعے وجود میں آتا ہے:

۱۔ ایوان زیریں یا قومی اسمبلی ۲۔ ایوان بالا یا سینٹ

ایوان زیریں یا قومی اسمبلی:

ملک میں ہونے والے انتخابات کے نتیجے میں ملکی سطح پر بننے والا قانون ساز ادارہ جس کے اراکین بلا واسطہ عوام کے ووٹوں سے بنتے ہیں۔[۱]

قومی اسمبلی کا رکن بننے کا طریقہ کار:

آئینِ پاکستان میں اس وقت دو سو ستھر ۲۷۰ قومی اسمبلی کے حلقے ہیں جن کا براہِ راست الیکشن ہوتا ہے جس میں جو بھی امیدوار باقی امیداروں سے زیادہ ووٹ لیتا ہے وہی قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ خواتین اقلیتوں کی بھی مخصوص نشستیں آئینِ پاکستان میں رکھی گئی ہیں۔ جو کہ متناسب نمائندگی کی بنیاد پر سیاسی جماعتوں کو دی جاتی ہیں۔[۲]

ایوانِ بالا (سینٹ)

پارلیمنٹ کا ایوانِ بالا

پارلیمنٹ کا ایوانِ بالا (سینٹ) فیڈریشن کا مظہر اور صوبوں سے برابری کی بنیاد پر نمائندگی کی وجہ سے ان کے حقوق کی حفاظت میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے سینٹ کو قومی اسمبلی کے مساوی حیثیت تو نہیں دی جا سکی، لیکن نصف درجن سے زیادہ ترامیم کے ذریعے اس کے اختیارات اور کردار میں خاطر خواہ اضافہ ضرور کیا گیا ہے۔ اب سینٹ سال میں ۹۰ دن کے بجائے ۱۱۰ دن لازمی سیشن میں رہے گا۔ متعدد سرکاری اور

---

(۱) اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، آرٹیکل ۲۲۲، ص ۱۴۱

(۲) اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، آرٹیکل ۶۲، ص ۳۵

پارلیمانی رپورٹوں کے سلسلے میں بھی یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ انہیں قومی اسمبلی کے ساتھ سینٹ میں بھی پیش کیا جائے، تاکہ سینٹ ان پر اپنی رائے دے سکے۔

جیسا کہ اُوپر عرض کیا گیا ہے، سینٹ جب سیشن میں ہو تو اس وقت بھی آرڈیننس کے اجراء پر پابندی لگادی گئی ہے۔ اہم حکومتی پارلیمانی کمیٹیوں میں سینٹ کو نمائندگی دی گئی ہے، یعنی ججوں کے تقرر کی کمیٹی اور الیکشن کمیٹی کے ارکان کی نامزدگی کی ذمہ دار کمیٹی وغیرہ میں۔ اسی طرح بجٹ، فنانس بل اور منی بل کے لیے بھی اب سینٹ میں غوروبحث اور اپنی تجاویز دینے کے لیے سات کے مقابلے میں ۱۴ دن مقرر کیے گئے ہیں۔ سینٹ کی سفارشات پر غور کرنا قومی اسمبلی کے لیے لازم ہو گیا ہے، گو کہ سینٹ پر یہ پابندی لازم نہیں ہے۔[۱]

اپنے جوہر کے اعتبار سے ایک بڑی اہم ترمیم یہ کی گئی ہے کہ اب مرکزی کابینہ اور وزیر اعظم، قومی اسمبلی کی طرح سینٹ کے سامنے بھی جواب دہ ہوں گے۔ گو وزیر اعظم کے انتخاب کا فریضہ صرف قومی اسمبلی ہی ادا کرے گی، لیکن حکومت کی جواب دہی کو اب پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں تک وسعت دے دی گئی ہے۔ اس سلسلے کی تمام ترامیم کے نتیجے میں توقع ہے کہ سینٹ کا کردار بڑھے گا، قانون سازی کا عمل بہتر ہو سکے گا اور صوبوں کی آواز کو زیادہ وقعت اور اہمیت حاصل ہو سکے گی۔ صوبائی خود مختاری کے نئے ماڈل پر عمل درآمد کے لیے سینٹ کا کردار بہت کلیدی اہمیت کا حامل ہے اور ان سب ترامیم کا حاصل فیڈریشن کے باہم اور متوازن تعلقاتِ کار کے تصور کو ایک قابلِ عمل صورت دینا ہے۔

کابینہ:

کابینہ کا مطلب یہ ہے کہ امورِ مملکت چلانے میں صدر پاکستان اپنی مدد اور سہولت کی خاطر وزراء کی ایک کابینہ تشکیل دیتا ہے۔ کابینہ کا سربراہ وزیرِ اعظم ہوتا ہے۔ یہ کابینہ اپنے تمام وفاقی وزراء اور وزرائے مملکت سمیت اجتماعی طور پر ایوانِ بالا (سینٹ) اور ایوانِ زیریں (قومی اسمبلی) کو جواب دہ ہوتی ہے۔[۲]

کابینہ کی تشکیل:

کابینہ تشکیل دینے کے لیے صدرِ محترم جنابِ وزیر اعظم سے مشاورت کے نتیجے میں دونوں ایوانوں کے اراکین میں سے وفاقی وزراء اور وزرائے مملکت کا تعین فرمائیں گے۔ لیکن اس بات کو مدِّ نظر رکھنا ضروری ہے کہ وفاقی

---

(۱) اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، آرٹیکل ۵۹، ص ۳۳

(۲)۔ ایضا ۹۱ ، ص ۵۷

وزراءاور وزرائے مملکت جو سینٹ سے لیے جارہے ہوں وہ کبھی بھی وفاقی وزراء کے حجم میں ایک چوتھائی سے زیادہ نہ ہوں۔ وفاقی وزیر یا وزیرِ مملکت اپنا عہدہ سنبھالنے سے قبل صدرِ محترم کے سامنے اپنی وزارت کا حلف لیں گے جس کی عبارت شیڈول سوم میں درج ہے۔ یہ وزراء اپنی وزرات چھوڑنا چاہیں تو اپنا استعفیٰ لکھ کر دستخط کر کے صدرِ محترم کو دیں گے۔ اور اگر ان وزراء کو ان کی وزارتوں سے برطرف کرنا ہو تو صدرِ محترم وزیرِ اعظم کے مشورے سے انہیں وزارت سے برطرف کر سکتے ہیں۔ (۱)

الیکشن کمیشن:

الیکشن کمیشن کا تصور آتے ہی ذہن اس طرف جاتا ہے کہ انتخابات کا نظام اور اس کا طریقہ کار، اگر الیکشن کمیشن آزاد اور خود مختار ہو تو اس کے نتیجے میں الیکشن کا نظام زیادہ غیر جانب دار اور شفاف ہو گا، جو جمہوریت کی روح ہے۔ آئین پاکستان کی رو سے الیکشن کمیشن ایک مستقل ادارہ ہو گا اور اس میں مرکزی کردار صرف الیکشن کمشنر کا نہیں بلکہ پورے کمیشن کا ہو گا، جو چیف الیکشن کمشنر اور چار ججوں پر مشتمل ہو گا، اور وہ چاروں صوبوں سے لیے جائیں گے۔ ان کا تقرر وزیرِ اعظم اور قائد حزب اختلاف باہمی مشورے سے کریں گے اور وہ تین نام ایک پارلیمانی کمیٹی کو دیں گے، جو ۱۲ افراد پر مشتمل ہو گی، جس میں ایک تہائی ارکانِ سینٹ ہوں گے اور یہ کمیٹی تجویز کردہ ناموں میں سے ایک کا انتخاب کرے گی۔ اسی طرح کمیشن کا تقرر پانچ سال کے لیے ہو گا اور اس میں توسیع نہیں ہو سکے گی۔ (۲)

پبلک سروس کمیشن:

آئینِ پاکستان میں درج ہے کہ پبلک سروس کمیشن کے سربراہ کا تقرر بھی وزیرِ اعظم اور قائد حزب اختلاف باہمی مشورے سے کریں گے ۔ آئین کی اس شق اور الیکشن کمیشن کی تعیناتی والی شق سے الیکشن کے نظام کو شفاف اور قابلِ اعتماد بنانے اور سروسز کے انتخاب کے عمل کو حکومتِ وقت کی گرفت سے نکالنے اور معیار و قابلیت کے نظام کو ترویج دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ (۳)

۳۔ انتظامیہ:

انتظامیہ کی دو قسمیں ہوتی ہیں

۱۔ سیاسی انتظامیہ

---

(۱)۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، آرٹیکل ۹۲، ص۵۹

(۲)۔ ایضاً، آرٹیکل ۲۱۳، ص۱۳۷

(۳)۔ ایضاً، آرٹیکل ۲۴۲، ص۱۵۹

۲۔ غیر سیاسی انتظامیہ

ا۔ سیاسی انتظامیہ سے مراد حکومت کے وہ افراد ہیں جو انتخابات کے ذریعے بر سرِ اقتدار آتے ہیں، وہ باقاعدہ ملازم نہیں ہوتے۔ بلکہ انتخابات کے ذریعے بر سرِ اقتدار آتے ہیں اور مقررہ مدت تک فرائض سرانجام دیتے ہیں جیسے وزیر اعظم اور وزراء کی کابینہ وغیرہ۔ جس کا قومی اسمبلی کے عنوان میں تفصیل سے ذکر کر دیا گیا ہے ان سب کو سیاسی انتظامیہ کہتے ہیں۔

۲۔ غیر سیاسی انتظامیہ سے مراد جو سرکاری ملازمین پر مشتمل ہوتی ہے۔ جیسے وزارتوں کے سیکرٹری ہر محکمے میں بطور سربراہ کے کام کرتے ہیں۔ سیکرٹری بائیسویں گریڈ کا اعلیٰ افسر ہوتا ہے ان کو عرفِ عام میں بیوروکریٹس کہا جاتا ہے۔ یہ تنخواہ دار ہوتے ہیں ان کا تعلق بظاہر کسی حکومت یا انتخابات سے نہیں ہوتا بلکہ جو بھی حکومت آئے یہ اپنے فرائض انجام دیتے رہتے ہیں۔ دستورِ پاکستان میں دونوں قسم کی انتظامیہ کے بارے میں قواعد وضوابط درج ہیں اور ان کے اختیارات اور حدود کا تعین درج ہے۔ حکومت کیسے بنے گی اور سرکاری ملازمین کس طرح اور کن شرائط پر بھرتی کیے جائیں گے۔ عام طور پر سرکاری ملازمین کو یہ آئینی تحفظ حاصل ہوتا ہے کہ ان کو کسی معقول وجہ کے بغیر ملازمت سے الگ نہیں کیا جاسکتا، اس لیے سیاسی حکومتیں آتی جاتی رہتی ہیں مگر یہ ملازمین اپنی جگہ بر قرار رہتے ہیں آنے والی حکومتیں اپنے منظور نظر افسران اور ملازمین کو من پسند جگہوں پر تعینات کرتی ہیں۔ حکومت اپنی حکمت عملی کے تحت ان ملازمین کا اکھاڑ پچھاڑ کرتی ہے کیونکہ حکومت کو اندیشہ ہوتا ہے کہ بعض ملازمین کی گرفت اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ وہ حکومتی فیصلوں پر اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ اس لیے ایسی صورتوں میں ان کے اثر ونفوذ کو ختم کرنے کے لیے ان کو ان کی جگہوں سے ہٹا کر دوسری جگہوں میں تبادلہ کر دیا جاتا ہے۔ افسروں کے اس اثر ونفوذ کو افسر شاہی یا نوکر شاہی کہتے ہیں عرف عام میں ان افسروں کو بیوروکریٹ اور ان کی افسر شاہی کو بیوروکریسی کا نام دیا جاتا ہے۔

حکومت کی درجہ بندی:

بنیادی طور پر ملک پاکستان میں حکومت کی مختلف درجہ بندیاں ہیں

ا۔ مرکزی / وفاقی حکومت

۲۔ صوبائی حکومت

۳۔ مقامی حکومت

آئینِ پاکستان میں درج ہے کہ بنیادی طور پر وفاقی حکومت پورے ملک کے نظام کی نگران ہوتی ہے۔ آئینِ پاکستان میں حالیہ ترامیم کے باوجود جس میں صوبوں کو کئی اختیارات دے دیئے گئے ہیں۔ نگران وفاقی حکومت ہی ہوگی۔ (۱)

---

(۱) آئینِ پاکستان، آرٹیکل ۹۰، ص ۵۷

حکومت یا انتظامیہ کے ماتحت آنے والے ادارے:

جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے کہ ملکی امور انتظامیہ / حکومت کے ذمے ہوتے ہیں اس طرح ملکی ادارے سوائے عدلیہ اور مقننہ کے تمام ادارے ان کے ماتحت ہوتے ہیں حالانکہ عدلیہ کے جج صاحبان کا تقرر وزیر اعظم یا صدر کرتے ہیں لیکن ان کو معزول کرنے کا اختیار انتظامیہ کے پاس نہیں ہے تاکہ اگر جج صاحبان انتظامیہ کے خلاف فیصلہ دیں تو بلا خوف و خطر دیں۔[1]

(۱) آئین پاکستان، آرٹیکل ۲۰۸، ص ۱۳۲

فصل سوم:

اسلامی ریاستی اداروں کی امتیازی خصوصیات

اسلامی ریاستی اداروں کی امتیازی خصوصیات:

ا۔ پہلی خصوصیت: حاکمیت الٰہ:

اسلامی ریاست کی پہلی خصوصیت یا جسے بنیادی خصوصیت کہا جاسکتا ہے وہ "حاکمیت الٰہ" ہے

اسلامی ریاست میں حاکمیت و اقتدار اعلیٰ کا منصب اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے۔ حاکمیت الٰہی یہی وہ بنیادی اصول ہے جس نے اسلامی ریاست کو دوسری ریاستوں سے انفرادیت عطاء کی اور اس کے نظم و نسق کو ایک خاص نہج پر استوار کیا۔

عہدِ قدیم سے اب تک ہر زمانے میں حاکمیت ریاست کا جزوِ لاینفک رہی ہے۔ تاریخ میں یہ بھی آتا ہے کہ حاکمیت مختلف ادوار سے ہوتی ہوئی مختلف ممالک میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتی رہی۔ اور ایسا بھی ہوا کہ اقتدار و حکومت کبھی تو بادشاہت و شہنشاہیت یا استبداد و آمریت کی شکل میں صرف ایک شخص کے ہاتھ میں رہی تو کبھی ایک مذہبی گروہ "پاپائیت" کے روپ میں مسند حکومت پر فائز ہوا۔ کبھی چند اشراف مقتدرِ اعلیٰ بن گئے اور کبھی جمہور کا اجتماعی وجود مستحقِ حاکمیت سمجھا جاتا رہا۔ غرضیکہ احوال و ظروف کے اعتبار سے حاکمیت کا نام اور اس کی ہیئت تو بدلتی رہی لیکن اس کا وجود تاریخ کے ہر دور میں موجود رہا۔

حاکمیت کے لغوی معنیٰ اور علم سیاسیات کی رو سے اس کی تعریف و خصوصیات کے مشاہدات کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی انسان یا انسانی ادارہ فی الحقیقت حاکمیت جیسے اعلیٰ وصف سے متصف نہیں ہو سکتا۔ یعنی کوئی انسان یا انسانی ادارہ ایسا نہیں ہو سکتا جس کا ہر حکم علی الاطلاق قانون کا درجہ رکھتا ہو، اسے افرادِ ریاست پر حکم چلانے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہوں اور تمام باشندے اس کی غیر مشروط اطاعت پر مجبور ہوں۔ اس کے اختیارات حکمرانی کو اس کے اپنے ارادے کے سوا کوئی خارجی چیز محدود کرنے والی نہ ہو۔ اس کو اللہ کے مقابل کسی قسم کا حق حاصل ہونا چاہئے، وہ اپنی ذات میں قادر مطلق ہو جو کچھ وہ کرے وہی چیز صحیح ہو، کوئی تابع اس کو غلط قرار نہ دے سکے۔ اس لیے ناگزیر ہو کہ اس کو سبوح وقدوس اور ہر قسم کی خطا و غلطی سے پاک مانا جائے خواہ وہ ایسا ہو یا نہ ہو ایسا تصور کسی انسان یا ادارے کے بارے میں قائم نہیں ہو سکتا۔

اس لیے یہی بات زیادہ منطقی اور مبنی بر حقیقت ہے کہ مقتدرِ حقیقی اور حاکم و قانون ساز، انسان کے بجائے اللہ تعالیٰ کو تسلیم کیا جائے۔ صفاتِ حاکمیت کا اطلاق وانطباق اس لیے بھی اس ذات قدوس کو سزاوار ہے کہ غیر محدود حاکمیت فی الواقع نہ تو کسی انسانی اقتدار کو حاصل ہو سکتی ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ کسی بادشاہ، پارلیمنٹ، قوم یا پارٹی کو ایک محدود دائرہ میں جو حاکمیت حاصل ہو وہ اسے بے عیب اور

بے خطا طریقے سے استعمال کرسکے۔کیونکہ ظاہرہے کہ ایسا علم جو تمام متعلقہ حقائق پرحاوی ہواور زمان و مکان کی حدودسے متجاوز ہو ایک انسان یا ایک ادارہ کو تو دور پوری نوعِ انسانی کو بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔

شرک کی ممانعت کی طرح اس کی اطاعت و فرمانبرداری سے روگردانی کرنے،اس کے حکم وقانون کی بجائے انسان کے بنائے ہوئے قانون کو اپنی زندگی کا راستہ بنالینے کی بھی ممانعت ہے۔کیونکہ حکم کااختیار خالقِ کائنات کی ذات لم یزل کوہی حاصل ہے۔جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ﴾(۱)

ترجمہ:کائنات کی ہر چیز اسی نے بنائی ہے اور حکم وقانون دینے کا اختیار بھی اسی کے پا س ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا یہ اصول اور انسان کی خلافت و جانشینی کا تصور اسلام کے دستوری اور انتظامی قانون کی بنیاد ہے،اور اسلامی ریاست کا بنیادی اصول ہے کہ کائنات کا خالق ومالک مطلق اور مختارِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے،اس لیے حکم کرنے،اقتدار کو استعمال کرنے ،نظام وقانون دینے،اچھے اور برے میں فیصلہ کرنے کا آخری ،حتمی اور حقیقی اختیار بھی اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔اس نظریہ کو عصرِ حاضر میں اصطلاحاً اقتدارِاعلیٰ کے نام سے موسوم کیاجاتا ہے۔

بیسویں صدی کے نامور مفکرومفسر قرآن سید قطب مصری اسلامی سیاسی نظام کے ممیزات پر گفتگو کرتے ہوئے واضح کرتے ہیں:

> "اسلامی سیاسی نظام کے دوسرے نظاموں سے یکسرمختلف ہونے کی بناءپراسلام کا اجتماعی اور سیاسی وحکومتی نظام کسی بھی قدیم و جدید سیاسی نظام سے مختلف ہے۔اسلامی سیاسی نظام کے مطابق حاکمیتِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہےاور وہی ذات انسانیت کے لیے شریعت وقانون وضع کرنے کا اختیاررکھتی ہے۔(۲)

ان کے نزدیک اسی بنیادی اصول پراسلام کے پورے اجتماعی اورسیاسی وریاستی نظام کی عمارت قائم ہوتی ہےجبکہ دیگر سیاسی نظام انسان کی حاکمیت کے اصول پر مبنی ہیں ،ان کے نزدیک انسان خوداپنے لیےشریعت وقانون وضع کرنے کا مجاز ہے۔اسلامی و غیر اسلامی سیاسی نظام میں پایاجانے والا یہی فرق اسلامی سیاسی نظام کو دیگر نظاموں سے یکسر مختلف وممتازکردیتا ہے۔

---

(۱)سورۃالاعراف: ۷/۵۴

(۲)عدالت اجتماعی دراسلام،سید قطب،کلیہ شروق،تھران،۱۹۶۳ء،ص:۲۱۷

قرآنی تعلیمات کے مطابق انبیاء کرام علیہم السلام کو ملنے والا اقتدار بھی اللہ تعالیٰ ہی کے اقتدار کا عطیہ ہوتا ہے۔اور یہ اقتدار نیابتِ الٰہی کے طور پر دیا جاتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق ارشادِ ربانی ہے:

﴿يٰدَاوٗودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى الخ﴾[1]

ترجمہ:اے داؤد بیشک ہم نے تجھے زمین پر نائب بنایا پس تم لوگوں میں حق کے ساتھ فیصلہ کرواور خواہشات کی پیروی نہ کرو پس وہ (خواہشات کی پیروی) تمہیں اللہ کی راہ سے بہکادے گی بیشک جو اللہ کی راہ سے بہکتے ہیں وہ سخت عذاب کے مستحق ہیں اس وجہ سے وہ حساب کے دن کو بھولے بیٹھے ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ بھی عالمگیر حکمرانی کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ اور انعام قرار دیتے ہیں۔آپ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے اقتدار اور قانون کو تسلیم کرنا اسلامی حکومت کا بنیادی اصول ہے۔[2]

حکیم الامت شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ریاست و حکومت میں اقتدار اور حاکمیت کا ماخذ انسان کے بجائے ذات باری تعالیٰ کو قرار دیا ہے۔نیز جمہوریت کے نظریہ عوامی اقتدار اعلیٰ کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اسے غیر منطقی قرار دیا ہے۔جیسا کہ آپ نے اپنے لیکچر بعنوان "مسلم ثقافت کی رو" کے دوران کہا:

"اسلام بحیثیت ایک سیاسی نظام کے اصول توحید کو انسانوں کی جذباتی اور ذہنی زندگی میں ہمہ وقت نبھانے کا عملی طریقہ ہے۔اس کا مطالبہ وفاداری خدا کے لیے ہے نہ کہ تخت وتاج کے لیے اور چونکہ ذات باری تعالیٰ زندگی کی روحانی اساس سے عبارت ہے،جس کی وجہ سے اللہ کی اطاعت شعاری کا درحقیقت مطلب ہے کہ انسان خود اپنی معیاری فطرت کی اطاعت شعاری اختیار کرتا ہے۔"

اسی بناء پر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اپنے اس نظریے کی وضاحت درج ذیل شعر میں کرتے ہیں کہ حاکمیت کا حق صرف خدائے بزرگ وبرتر کو ہی ہے:

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے

---

(۱)سورۃ ص: ۲۶/۳۸

(۲)احیاء العلوم،ابو حامد محمد بن محمد المعروف الغزالی،ناشر دار السقا،دمشق،شام،ص:۴۱

حکمراں ہے اک وہی باقی بہتان آزری [1]

ایسے ہی امام راغب اصفہانی نے اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف 'مفردات 'میں اللہ تعالیٰ کو قوانین کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔[2]

ابوالحسن ماوردی نے اپنی سیاسی تصنیف 'احکام السلطانیہ'میں ابتداء ہی میں اللہ رب العزت کی جلالت ،مرتبہ ،منزلت بیان کر کے کتاب کا آغاز کیا ہے۔[3]

ابن تیمیہ نے بھی اپنی کتاب 'السیاسۃ الشرعیۃ'کی ابتداء میں ہی اللہ تعالیٰ کے لیے حقیقی حاکمیت واقتدار کا اعتراف کیا ہے۔[4]

مختصر یہ کہ حاکمیت اعلیٰ کا وہ بنیادی اصول جو ریاست اسلامی کا سنگ بنیاد ہے اور اس کے تمام اداروں کا جامع اور انہیں باہم مربوط کرنے والا ہے۔درحقیقت اپنی تمام جزئیات وتفصیلات کے ساتھ ایک جامع اور مکمل نظریہ ہے،جو اسلامی ریاست کو دوسری ریاستوں سے منفرد اور ممتاز کرتا ہے۔ یعنی اسلام میں اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے،اور وہی قانون سازی کا مرجع ہے،اور اسی کی نازل کردہ شریعت یعنی صرف قرآن و سنت کی نصوص سب پر حاکم ہیں

مختصر یہ کہ حاکمیت اعلیٰ وہ بنیادی خصوصیت ہے جو ریاست اسلامی کو دوسری ریاستوں سے ممتاز کرتی ہے۔

۲۔دوسری خصوصیت:شورائیت(شورائی نظام):

شوریٰ کو اسلام میں بڑی اہمیت دی گئی ہے اور حکمرانوں کے لیے مملکت کے امور کی انجام دہی شوریٰ کے ذریعے سرانجام دینے کی تلقین کی گئی ہے اسلامی نظام کی حامل ریاست میں مشاورت کی اہمیت کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ قرآن کریم کی مکمل سورۃ کو الشوریٰ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔اسلامی ریاست میں شورائی نظام کا ایک خاص مقام ہے یہی وجہ تھی کہ ربّ العالمین نے اپنی کتاب میں بھی مسلمانوں کے معاملات کی تعریف درج ذیل الفاظ میں کی ہے:

---

(۱)بانگ درا،علامہ محمد اقبال،فیروز سنز،لاہور،ص:۲۴

(۲)مفردات القرآن فی غریب القرآن،ابوالقاسم حسن بن محمد المعروف علامہ راغب اصفہانی،ناشر اسلامی اکیڈمی ۱۹۷۳، لاہور،ص:۱۹

(۳)الاحکام السلطانیۃ،ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب البصری الماوردی،ناشر مکتبۃ دار ابن قتیبۃ ۱۹۸۹،کویت،ص:۷

(۴)السیاسۃ الشرعیہ،ابوالعباس احمد المعروف ابن تیمیہ،ناشر دائرہ نورالقرآن،لاہور،ص:۹

﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾[1]

ترجمہ: ان کے امور باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔

اسلامی ریاست کے اس بنیادی اصول کی طرف مسلمانوں کی راہنمائی کی غرض سے ربِ کائنات نے خود اپنے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ سے فرمایا:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾[2]

ترجمہ: باہمی معاملات میں مشاورت سے کام لو۔

پہلے بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ مذکورہ بالا آیات ظاہر کرتی ہیں کہ شوریٰ ایمان والوں کے خصائص میں سے ہے جس سے انہیں مزین ہونا چاہیے۔اہلِ شوریٰ اور سربراہِ مملکت کا ان صفات سے مزین ہونامعاشرے میں ان کو مقبول ومعتمد بنا دیتاہے کیونکہ اسلامی ریاست کے سربراہ کے لیےاکثریت کے اعتماد کا حامل ہونا ضروری ہے اور اسی صورت ممکن ہے جب رعایایاعوام کے اموراور معاملات میں ان کے حقوق کالحاظ رکھاجائےاور ان کو طے کرنے کے لیے باہمی مشورے سے کام لیاجائے۔

خلیفہ اول سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پہلے خطبۂ خلافت کے دوران فرمایا:

"فَإِذَا رَأَيتُمُونِي قَد استَقَمتُ فَاتَّبِعُونِي وَإِن زَغتُ فَقُومُونِي "[3]

ترجمہ: جب تم مجھے دیکھو کہ میں سیدھے راستے پر چل رہا ہوں تو میری اتباع کرنا اوراگر میں راہِ راست سے ہٹ جاؤں تو مجھے ٹھیک کر دو۔

یہی طریقہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا بھی رہا، آپ رضی اللہ عنہ کا فرمان مشہور ہے کہ:

"لَاخَلَافَةَ اِلَّا عَن مَّشوَرَةٍ"[4]

ترجمہ: مشورے کے بغیر خلافت نہیں ہے۔

عہد خلافت میں شوریٰ کے اہم اجلاسوں کا تذکرہ کتبِ تاریخ میں موجود ہے۔مثلاً خلفائے اربعہ کے انتخاب کی مختلف سورتوں کے علاوہ شوریٰ برائے لشکرِ اسامہ، شوریٰ برائے منکرینِ زکوٰۃ اور معاہدہ بیت المقدس کے حوالے سے حضرت عمر کی شوریٰ وغیرہ اس سلسلے کی اہم مثالیں ہیں۔

---

(۱)سورۃ الشوریٰ: ۴۲/۳۸

(۲)سورۃ العمران: ۳/۱۵۹

(۳) صحیح بخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل، بخاری، الادب المفرد، ص:۵۳

(۴) کنز العمال، علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین الہندی، مکتبۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۵ء، ۱۳۴۱۳۹/۴

اسلامی ریاست کا شورائی پہلو اس کی خصوصیت و انفرادیت ہے۔ عہد نبوی میں اور خلفاء راشدین کے ادوار میں شوریٰ سمیت ریاست کے تمام بنیادی اصولوں کو ان کی روح کے مطابق قائم کیا گیا جو عصرِ حاضر میں بھی اسلامی ریاست کی اساس ہے۔ شوریٰ کے نظام کو اسلامی ریاست میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ شوریٰ پر مقننہ کے عنوان کے تحت سیر حاصل بحث کی جاچکی ہے

۳۔ تیسری خصوصیت: قانون کا سب پر یکساں اطلاق

اسلامی ریاست میں حاکم و محکموم، صاحبِ امر اور مامور کے درمیان قانون کی تنفیذ میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ قانون سب کے لیے ایک ہے اور سب پر یکساں نافذ ہوتا ہے۔

عہد نبوی میں قبیلہ بنی خزوم کی ایک معزز عورت کے لیے چوری کی پاداش میں قطع ید کی سزا پر عمل درآمد ہونے والا تھا کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو سفارشی بنایا گیا تاکہ معزز عورت کو درگزر کیا جائے، جس پر سابقہ قوموں کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد کیا:

((إِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ وَإِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الضَّعِيفُ أَقَامُوا عَلَيْهِ الْحَدَّ وَايْمُ اللَّهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا)) (۱)

ترجمہ: جب چوری کرتا ان میں سے معزز تو اس کو چھوڑ دیتے تھے، اور جس وقت چوری کوئی کمزور شخص کرتا تو کمزور پر حد لگاتے۔ واللہ (قسم ہے) اگر میری بنت (بیٹی) فاطمہ نے چوری کی ہوتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا۔

اس واقعہ سے اسلامی ریاست کے خاص معیاری قانون اور معاشرتی مساوات کی ایسی عملی تصویر جھلکتی ہے جو اسلامی نظام کے علاوہ کسی بھی دوسرے نظام میں موجود نہیں ہے۔

۴۔ چوتھی خصوصیت: اربابِ اختیار لوگوں کے معتمد ہوں

اسلامی ریاست کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اربابِ اختیار لوگوں کے معتمد ہوں یعنی ریاستی ذمہ داریوں پر ایسے اہل اور موزوں افراد کا تقرر کرنا چاہیئے جن پر عوام الناس کا اعتماد بھی ہو۔

اس ضمن میں ارشادِ نبوی ہے:

---

(۱) صحیح بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری، دار طوق النجاۃ، ط، اولیٰ، ۱۴۲۲ھ، کتاب الجمعۃ، باب الطیب للجمعۃ، حدیث نمبر، ۸/۵۸۶ ۳۴۷۵

((خِيَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِينَ تُحِبُّونَهُمْ وَيُحِبُّونَكُمْ وَيُصَلُّونَ عَلَيْكُمْ وَتُصَلُّونَ عَلَيْهِمْ وَشِرَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِينَ تُبْغِضُونَهُمْ وَيُبْغِضُونَكُمْ وَتَلْعَنُونَهُمْ وَيَلْعَنُونَكُمْ)) (۱)

ترجمہ: تمہارے اچھے امام و قائد وہ ہیں جنہیں تم چاہتے ہو اور وہ تمہیں چاہتے ہیں، تم ان کو دعائیں دیتے ہو اور وہ تمہیں دعائیں دیتے ہوں۔ اور تم میں بدترین رہنما وہ ہیں جو تمہیں ناپسند ہیں اور تم انہیں ناپسند ہو، تم انہیں لعنت اور وہ تمہیں لعنت کرتے ہیں۔

اس نوعیت کی خالص ریاست کے لیے ایک ریاست بن جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ لیکن اگر زمین کے مختلف حصوں میں قائم بہت سی ریاستیں بھی اس نوعیت کی ہوں تو وہ سب کی سب یکساں اسلامی ریاستیں ہوں گی۔ اس طرح کسی قوم کے ساتھ کشمکش کے بجائے باہمی برادرانہ تعاون ممکن ہو گا اور وہ کسی وقت بھی متفق ہو کر عالمگیر وفاق قائم کر سکیں گی۔

۵۔ خصوصیت: عوام کی بنیادی ضروریات اسلامی ریاست کا فرض:

عوام کے لیے بنیادی ضروریات (Basic Needs) اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے مثلاً روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم، پانی، صحت وغیرہ۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد پاک ہے: "کہ بنی نوع انسان کے لیے اس سے بہتر حق کوئی نہیں ہو سکتا کہ اس کے پاس رہنے کے لیے ایک مکان ہو اور کچھ کپڑا جس سے وہ اپنی ستر کو چھپا سکے اور کچھ روٹی اور کچھ پانی۔ (۲)

آپ نے مزید فرمایا کہ، : "حکومت اس شخص کی نگہبان ہے جس کا کوئی نگہبان نہیں ۳)۔

اس حدیث کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے انسان کی چار بنیادی ضروریات کا ذکر کیا ہیں جو ان کو ملنی چاہئیں، پہلا مکان، دوسرا کپڑا، تیسرا روٹی اور چوتھا پانی۔ کارل مارکس نے صرف پانی نکال کر روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگا کر اشتراکیت کی بنیاد رکھی۔

حضرت علی نے فرمایا کہ :' اللہ نے دولت مندوں (بشمول حکومت) پر یہ فرض کیا ہے کہ وہ غریبوں کی بنیادی ضروریات کو مہیا کریں۔ اگر یہ بھوکے یا برہنہ یا کسی دوسری معاشی تنگ دستی میں مبتلا

---

(۱) صحیح مسلم، مسلم بن حجاج، کتاب الامارۃ، باب باب خِيَارِ الأَئِمَّةِ وَشِرَارِهِمْ، حدیث نمبر، ۴۹۱۰، ۵/۳۰۳

(۱) ترمذی، باب الزهد: ۳۶، حدیث نمبر: ۳۸ (یا حدیث نمبر: ۲۳۴۱)

(۲) ابو داؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی المشهور بأبي داود، المکتبہ الاسلامی بیروت لبنان، ص ۶۰

ہیں تو یہ صرف اس لیے کہ دولت مند(بشمول حکومت) اپنا فریضہ پورا نہیں کر رہے ہیں۔ اس لیے قیامت کے دن اللہ ان سے اس بارے میں پوچھے گا اور اسی کی مطابق سزا دے گا۔[1]

(۳) المحلی بالآثار، أبو محمد علي بن أحمد بن سعيد بن حزم الأندلسي القرطبي الظاهري، دار الفكر – بيروت،لبنان،ص۲۵۶

فصل چہارم:

جمہوری ریاست کے اداروں کی خصوصیات

جمہوری ریاست کے اداروں کی خصوصیات:

امریکی ماہرِ جمہوریت لیری ڈائمنڈ کے مطابق، جمہوریت چار کلیدی عناصر پر مشتمل ہے:

۱۔ آزاد اور منصفانہ انتخابات کے ذریعہ حکومت کو منتخب کرنے اور تبدیل کرنے کے لیے ایک سیاسی نظام۔

۲۔ عوام کی بطورِ شہری سیاست اور شہری زندگی میں بھرپور شرکت۔

۳۔ تمام شہریوں کے انسانی حقوق کی حفاظت۔

۴۔ قانون کی حکمرانی ہو مطلب یہ کہ جس میں قوانین اور طریقہ کار تمام شہریوں کے درمیان مساوات پر مبنی ہوں۔

اس کے باوجود ہماری توجہ یہ ہے کہ جمہوریت اور انسانی حقوق دو مختلف نظریات ہیں اور "اس میں زیادہ سے زیادہ خاصیت ہونا ضروری ہے۔[۱]

جمہوری ریاست کی بنیادی خصوصیات درج ذیل ہیں:

جمہوری ریاست کے اداروں کی خصوصیات:

۱۔ حکومت میں شرکت کا احساس:

جمہوریت کی نمایاں خصوصیات میں سے ہے کہ عوام کو احساس ہوتا ہے کہ وہ بھی کاروبار حکومت میں شریک ہیں۔ کیوں کہ حکومت چلانے والے عوام کے نمائندے ہوتے ہیں جو عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر آتے ہیں، اس لیے وہ پارلیمنٹ کے تشکیل کردہ قوانین اور حکومت کے فیصلوں کی پابندی کرتے ہیں اور ملک کی خاطر تمام ہر ایثار کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتے ہیں۔ کیونکہ جمہوریت میں بلند ترین مقام عوام کی رائے کو حاصل ہوتا ہے اور جمہوری نظام کی اعلیٰ ترین ترجیح عوام کی حفاظت اور ترقی ہے۔[۲]

۲۔ حقوق کا تحفظ:

جمہوریت میں عوام کے حقوق مکمل طور پر محفوظ ہوتے ہیں۔ عوام کے منتخب نمائندے پارلیمینٹ میں ہوتے ہیں۔ جو ایسا قانون بننے نہیں دیتے جو لوگوں کے حقوق کے منافی ہو اسی طرح عوام کے نمائندے حکومت کو ایسے اقدامات اٹھانے نہیں دیتے جن سے عوام کے حقوق غصب ہونے کا خطرہ ہو۔

---

(۱)Diamond L, Lecture at hilla university for humanistic studies21 January 2004 London. "What is democracy?"

(2) Democracy,encyclopaedia Britannica,William Benton,frederick 1970, p ۱۰

۳۔ اختیارات بطور امانت

عوام اپنے نمائندے منتخب کر کے ان کو نظامِ حکومت چلانے اور عوام کی فلاح و بہبود کے فروغ کا اختیار دیتے ہیں۔ اربابِ حکومت کو خیال ہوتا ہے کہ عوام نے انہیں ایک مخصوص مدت کیلیے حکومت کرنے کا اختیار دیا ہے ۔ اگر انہوں نے ان اختیارات کا ناجائز استعمال کیا تو آئندہ وہ عوام کے اعتماد سے محروم ہو جائینگے۔اس لیے حکومت ایسے کوئی اقدامات نہیں اٹھاتی جو عوام کی ناراضگی کا باعث ہو۔

۴۔ عوام کی سیاسی واخلاقی تربیت

جمہوریت عوام کی سیاسی اور اخلاقی تربیت کا بہترین ذریعہ ہے۔ عوام کو مقامی سطح سے لے کر قومی سطح تک متعدد بار انتخاب کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے ہر سیاسی جماعت اپنے امیدوار کے حق میں حمایت حاصل کرنے کے لیے عوام سے رجوع کرتی ہے اور قومی مسائل پر اپنا نقطہ نظر پیش کرتی ہے۔ اس سے عوام کو سیاسی جماعتوں کے پروگراموں اور ان کے امیدواروں کے متعلق کوائف سے مکمل آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ جس سے وہ بہتر امیدوار کا انتخاب کرسکتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کو اپنے حقوق اور فرائض سے بھی آگاہی ہوتی ہے ان کو اپنے ووٹ کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بار بار انتخابات ہونے سے عوام میں یہ احساس بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان پر کتنی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اگر انہوں نے اپنا ووٹ لالچ میں آکر دیا تو اس سے ناقابلِ تلافی قومی نقصان ہو گا۔اس طرح جمہوریت سے نہ صرف عوام کی سیاسی بلکہ اخلاقی تربیت بھی ہوتی ہے۔ (۱)

۵۔ جمہوری نظام میں جواب دہی کا تصور:

جمہوریت میں ہر سطح پر جوابدہی کا تصور پایا جاتا ہے جس کے باعث حکمرانوں کے اختیارات کے ناجائز استعمال کے مواقع کم ہو جاتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے نمائندے عوام کے روبرواور پارلیمانی حکومت پارلیمنٹ کے رو برو جوابدہ ہوتی ہے۔ اگر منتخب نمائندے عوام کی منشاء اور اپنے وعدوں کے مطابق قانون سازی نہیں کرتے تو اگلے انتخابات میں عوام ان کو مسترد کر دینگے۔اسی طرح پارلیمنٹ میں حزب اختلاف بر سر اقتدار جماعت کا احتساب کرتی ہے اس سے کابینہ کے ارکان مستعد رہتے ہیں اور کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو عوام کے مفادات کے خلاف ہو۔ جوابدہی کا یہ تصور جمہوریت میں اپنی مثال آپ ہے۔ (۲)

---

(۱)Defination of democracy, www.merriam- Webster.com ,5 july 2018

(۲)جمہوریت کیا ہے،وجاہت مسعود، ص:۸۲

۶۔ جذبہ حب الوطنی کا فروغ:

جمہوریت سے عوام میں حب الوطنی کا جذبہ فروغ پاتا ہے ۔جمہوریت کی بنیاد یہ ہے کہ عوام کی حکومت عوام کے لیے۔اس سے عوام میں یہ اطمینان پیدا ہوتا ہے کہ وہ حکومت کے کاروبار میں شریک ہیں۔اس سے عوام قومی امور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ان میں اپنے وطن سے محبت کا جذبہ فروغ پاتا ہے۔

۷۔ انقلابات سے تحفظ:

جمہوریت کا نظام لچکدار ہوتا ہے۔ ناپسندیدہ عناصر کو انتخابات کے ذریعے مسترد کیا جاسکتا ہے۔ افکار و خیالات کی مکمل آزادی کے باعث عواام اپنے جذبات کا اظہار کرسکتے ہیں اور حکومت پر کھل کر تنقید کر سکتے ہیں۔ حکومت رائے عامہ کو نظر انداز نہیں کرتی۔اگر حکومت عوام کے مشوروں اور ان کی منشاء کو نظر انداز کر دے تو آئندہ انتخاب میں عوام ایسی حکومت کو پر امن طور پر تبدیل کرسکتے ہیں۔اس طرح عوام کو حکومت تبدیل کرنے کیلیے تشدد کا راستہ اختیار نہیں کرنا پڑتا اور ملک انقلابات سے محفوظ رہتا ہے۔اس طرح جمہوری نظام میں ریاست کے مختلف شعبوں میں اختیارات اور ذمہ داریوں کی تقسیم سے توازن پیدا کیا جاتا ہے۔[1]

۸۔ امن پسند نظام:

جمہوری نظام دوسرے نظاموں کے مقابلے میں زیادہ امن پسند ہے۔اس میں اقتدار عوام کے نمائندوں کے پاس ہوتا ہے اور جوابدہی کے تصور کی وجہ سے وہ کوئی ایسا فیصلہ نہیں کر سکتے جو عوام کو ناپسند ہو۔ انسانوں کی اکثریت امن پسند ہوتی ہے اس کے برعکس ایک بادشاہ یا آمر اپنے اقتدار کو وسعت دینے کے مرض میں مبتلا ہوتا ہے جس کا نتیجہ دوسروں سے لازمی تصادم ہوتا ہے۔

قدیم یونان سے جدید دور تک انسان نے جو تجربات کیے ہیں وہ ریاست سے متعلق ان کے کسی نظریات کی مختلف صورتوں میں نمود اور اظہار ہے ۔ ظاہر ہے مسلمان معاشرے بھی ان بحثوں سے خالی نہیں رہے ہیں کہ مسلمانوں کے نظریے اور ان کی ریاست میں آپس کا تعلق کیسے ہونا چاہیئے ؟۔ مسلمان اس کو کیسے دورِ جدید میں نبھاتے ہیں۔؟۔کیا کسی ریاست کو کسی نظریے کا تابع ہونا چاہیئے۔؟ انسان کا جو فطری سفر ہے اس میں کیا کوئی نظریہ ایسا ہے جو ریاست کی تکمیل میں ناگزیر ہو۔؟

اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس ضمن میں اس بحث کا ایک ابتدائی خاکہ سامنے رکھتے ہیں۔ تاکہ بحث نہ صرف آسان وعام فہم ہو بلکہ اپنی مرکزیت کی طرف بھی مرکوز رہے۔

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ، قطب الدین شاہ ولی اللہ، بیروت لبنان، ص ۲۳۵

ریاست سوسائٹی کا ایک ناگزیر ادارہ ہے۔ معاشرہ جن اقدار پر قائم ہے یا قائم رہنا چاہتا ہے۔ ریاست ان اقدار کو استوار کرنے کے بہت ضروری وسائل فراہم کرتی ہے۔ لہذا ریاست اسی نظریہ حیات یا اسی نظامِ اقدار کا ایک فعال عنصر ہوگی۔ جس نظریے پر معاشرہ قائم ہے۔ انسانوں میں ہئیتِ اجتماعی وحدت اور ایک بامقصد یکسوئی ہمیشہ بامعنی ہوتی ہے۔ یعنی ثقافتی اقدار کو واجب العمل بنانا اور ثقافتی اساس کے ساتھ معاشرے کے تعلق کی تمام سطحوں کو بامعنی بنانا، Protective بنانا۔[1]

یہ معاشرے کی ایک ایسی ضرورت ہے جس کو معاشرہ اپنے اندر موجود معاشرتی قوت سے پورا نہیں کر سکتا۔ لہذا معاشرے کی اس ضرورت کی تکمیل کے لیے ریاست کا ادارہ وجود میں آتا ہے جو کہ معاشرتی کُل کا ایک جُز ہے

ریاست میں فوری فلاح پیدا کرنے کی قوت ہوتی ہے۔ معاشرے کی ترکیبِ ہئیت ہی ایسی ہوتی ہے یا انسانی اجتماعیت کے بعض اصول ایسے ہوتے ہیں کہ وہ فلاح کو اخلاقی معنی سے منقطع کر کے قبول نہیں کر سکتی۔ معاشرہ اپنی ایک اخلاقی بناوٹ اور ایک اخلاقی تقاضا بھی رکھتا ہے۔ اور ان پر پورا اترنے کے لیے اُسے ریاست کی فیصلہ کن مدد کی ضرروت ہوتی ہے۔ انسان میں فلاح کا تصور چیزوں کی افراط نہیں ہے۔

نظریہ کوئی ریاستی قانون نہیں ہوتا۔ نظریہ ایک معاشرتی حقیقت ہے۔ یعنی معاشرہ نظریہ کو آئیڈیلائز بناتا ہے، اور ریاست اسے حقیقت پر مبنی کرتی ہے۔ مملکت کے فرائض میں ہے کہ مملکت معاشرے کے آئیڈیلز عمل میں لانے کے مؤثر اسباب پیدا کرے۔ انسانوں کی اجتماعیت کے اندر کوئی بھی نظریہ ایک لمحہ کے لیے بھی پنپ نہیں سکتا جو اُس معاشرے میں موجود تنوع یا تضاد کو اپنے اندر سے خارج کر دے۔ ریاست کا نظریاتی کردار یہ ہے کہ اگر نظریہ تنوع کو قبول نہیں کرتا تو وہ انسانوں کے لیے نہیں ہے۔ ریاست نظریے کی آئیڈیل حدوں کو متاثر نہیں کرتی۔ اور اس کے بغیر انسان میں اجتماعیت کا کوئی بھی تصور خواہ وہ معاشرتی ہو، ریاستی ہو کسی بھی سطح پر آج تک قائم نہیں ہوا۔[2]

ریاست اور نظریہ:

ہماری غلطی یہ ہے کہ ہم نے مذہب کو قانونی اصطلاحات میں اسیر کر کے ایک طاقت پر قائم رہ جانے والا نظام بنا کر پیش کیا۔ ہمارا معاشرہ ہو یا ریاست، اس نے دین کے احکامات کی اخلاقی روح کو اقدار بنانے کے بجائے دین کے احکام کو مجموعہِ قوانین بنا کر اس کو بلا لحاظ نافذ کر دینے کا ایک تصور پال رکھا ہے۔ جو ہمارے یہاں ریاست اور نظریے کے تعلق میں ایک تصنوع، جبر اور ناکامی کا سبب بنا ہے۔ جب ہم اسلام کو لوگوں کے سامنے پیش کر رہے

---

(۱) اسلام اور سیاسی نظریات، مفتی تقی عثمانی، ص:۹۸

(۲) ایضاً

ہوتے ہیں تو ایسا نہیں ہوتا کہ ہم اقدار پر مبنی کسی تصور کی بات کر رہے ہیں بلکہ ہم قوانین پر ایک فکر کو فروغ دے رہے ہوتے ہیں جس پر ہمارا تمام اصرار اسی بات پر ہوتا ہے کہ یہ قوانین نافذ کر دیئے جائیں یا یہ حدودِ قوانین آجائیں تو اس سے فلاح آسکتی ہے لہذا اس طرزِ عمل سے ریاست اور نظریہ کا جو بنیادی تعلق ہے وہ مجروح ہو جاتا ہے۔ اسلام بنیادی طور پر اقدار پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جس کے نتیجے میں قانون بھی بنے گا اور اقدار بھی پیدا ہوں گے۔ نہ کہ قانون سازی کے ذریعے وہ ریاست یا سوسائٹی پر اثر انداز ہونا چاہتا ہے۔ (۱)

اسلامی جمہوری ریاست کے خدوخال جانے بغیر وطن عزیز کو کتنا ہی آزمائشی طور پر چلا لیا جائے، آگے بڑھنا مشکل ہے۔ ہمارے سامنے خلیفہ دوم جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ایک دلیرانہ اعلان جو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھری مسجد میں کیا تھا، اگر مجھ میں کوئی کجی ٹیڑھا پن دیکھو تو مجھے ٹوک دو، میری پکڑ کرو، مجھ سے سوال کرو۔ (۲)

اسلامی جمہوری ریاست کا نظامِ حکومت سیاسی دنیا کے لیے ناموسِ اکبر کا درجہ رکھتا ہے۔ اسلامی نظام حکومت کا مآخذ اللہ کا آخری قانون ہے۔ اور یہ تمام برائیوں کا خاتمہ کرتا ہے۔ اسلام جہاں انفرادی حیات میں فرد کی اصلاح پر زور دیتا ہے، وہیں اجتماعی زندگی کے زریں اصول بھی وضع کرتا ہے، جو زندگی کے ہر شعبے میں انسانوں کو راہ نمائی دیتے ہیں۔ اسلامی جمہوری نظام میں جیسے عبادات کی اہمیت دی گئی ہے ویسے ہی اخلاق و معاشرت اور معاملات کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ جیسے اسلام کا اپنا معاشی نظام ہے اور اپنے اقتصادی اصول ہیں۔ ویسے ہی اسلام اپنا سیاسی نظام اور نظام حکومت بھی رکھتا ہے۔ اسلامی نظام کے اندر ریاست اور دین مذہب اور سلطنت دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ دونوں کے تقاضے ایک دوسرے سے پورے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب دین کمزور پڑتا ہے تو حکومت بھی کمزور پڑ جاتی ہے، اور جب دین کی پشت پناہ حکومت ختم ہوتی ہے تو دین بھی کمزور پڑ جاتا ہے، اس کے نشانات مٹنے لگتے ہیں۔ اس کی زندہ مثال مصر کی اخوان المسلمون جماعت ہمارے سامنے ہے۔ اسلامی فکر میں دین اور سیاست کی دوری کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ اپنی حکومت کو اسلامی اصولوں پر قائم کرنے کی جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ یہ جدوجہد ان کے دین و ایمان کا تقاضہ ہے۔ قرآن پاک اور احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جس طرح اخلاق اور حسنِ کردار کی تعلیمات موجود ہیں۔ اسی طرح معاشرت، تمدن اور حکومت کے بارے میں بھی واضح احکامات موجود ہیں۔ (۳)

---

(۱) جمہوریت کیا ہے، وجاہت مسعود، ص:۱۸۔۱۹

(۲) الدولۃ العربیۃ الاسلامیۃ الاولیٰ، ڈاکٹر عصام شبارو، دار النھضۃ العربیۃ، ۱۹۹۵، بیروت، لبنان، ص:۲۷۹

(۳) حجۃ اللہ البالغہ، قطب الدین شاہ ولی اللہ، بیروت لبنان، ص۲۳۵

باب چہارم:

اسلامی وجمہوری ریاستی اداروں میں سربراہان کے تقرر کے اصول وضوابط کا جائزہ

فصل اول: اسلامی ریاست میں اداروں کے سربراہان کے تقرر کے اصول

فصل دوم: جمہوری ریاست میں اداروں کے سربراہان کے تقرر کے اصول

فصل سوم: اداروں پر سربراہان کے اثرات اہلیت اور نااہلیت کے تناظر میں

فصل چہارم: اسلامی وجمہوری ریاست کے مابین تصادم اور اس کا حل

فصل اول:

اسلامی ریاست میں اداروں کے سربراہان کے تقرر کے اصول

اسلامی ریاست میں اداروں کے سربراہان کے تقرر کے اصول:

دینِ اسلام کے نظام پر مبنی ریاست میں تمام اداروں کے سربراہ اہلیت کی بنیاد پر لگائے جاتے ہیں ذیل میں ان بنیادی اصولوں کو بیان کیا جارہا ہے جو کسی بھی ادارے کے سربراہ کے لیے لازمی ہیں۔

عدلیہ کے سربراہ کے تقرر کی بنیادی شرائط:

عدلیہ کے سربراہ کے لیے اسلام نے مندرجہ ذیل شرائط مقرر کی ہیں ان شرائط پر پورا اترنے والا ہی عدلیہ کا سربراہ یا قاضی القضاء کی مسند پر بیٹھ سکتا ہے۔

۱۔ اسلام:

مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے غیر مسلم قاضی کا تقرر باطل ہے اس کے فیصلہ کی کوئی شرعی حیثیت نہیں۔ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۵ سے اسی کی تصریح ہوتی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِنْكُمْ﴾[1]

ترجمہ: ان عورتوں پر اپنے میں سے چار گواہ بنالو۔

مذکورہ آیت کی تفسیر میں علامہ سعدی لکھتے ہیں:

"أي من رجالكم المؤمنين العدول"[2]

ترجمہ: یعنی مؤمن عادل مردوں میں سے۔

جس سے ظاہر ہے کہ مؤمن ہو

۲۔ بلوغت:

ظاہر ہے کہ کسی بچے کو قاضی نہیں لگایا جاسکتا اس لیے بالغ ہونا بنیادی شرط ہے۔

---

(۱) سورۃ النساء: ۴/ ۱۵

(۲) تیسیر الکریم الرحمن في تفسیر کلام المنان، عبد الرحمن بن ناصر بن عبد اللہ السعدي، مؤسسۃ الرسالۃ، الأولی، ۲۰۰۰ء، ۱/ ۱۷۱

۳۔عاقل / دانا:

دانا ہونے کا مطلب ہے کہ کہ قاضی کو کئی فیصلوں میں فہم و فراست کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ قاضی بھی کمال درجے کا عقلمند ہو ایک غیر عاقل جس کو اپنی خبر ٹھیک سے نہیں ہوتی اس کا قاضی القضاء کی حیثیت سے تقرر کرنا غیر دانشمندانہ کام ہے۔

۴۔ آزاد:

یہ بات کہ قاضی کا آزاد ہونا یعنی غلام کو قاضی نہیں لگایا جا سکتا۔ ایک غلام کیسے آزادانہ فیصلے صادر کر سکتا ہے جب کہ وہ خود کسی دوسرے کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ آج کل تو غلامی کا تصور اس طرح تو ختم ہے جس طرح قرونِ اولیٰ میں تھا لیکن اس آزادی کو اگر عموم پر محمول کیا جائے تو قاضی کے لیے ہر طرح سے آزاد ہونا ضروری ہے۔ مالی دباؤ، ذہنی دباؤ، سیاسی دباؤ، قرابتداری کا دباؤ، طاقت اور زور زبردستی کا دباؤ غرض ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا ضروری ہے۔

۵۔مرد (رجل):

قاضی القضاء کا مرد ہونا ضروری ہے کیوں کہ خواتین اسلامی تاریخ میں کبھی قاضی القضاء کے منصب پر فائز نہیں ہوئیں۔ اس پر دلیل یہ دی جاتی ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے۔ **الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ**۔[1]

ترجمہ: مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔

حاکم کا لفظ عام ہے نہ حاکم بمعنیٰ خلیفہ بن سکتی ہیں نہ ہی حاکم بمعنیٰ قاضی بن سکتی ہیں۔ آپ ﷺ کے فرامین سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے آپ ﷺ کا فرمان ہے

لاتکون المراءۃحکماتقضیٰ بین العامّۃ[2]

ترجمہ: عورت حاکم نہیں ہو سکتی جو عوام کے فیصلے کرتی ہو۔

اس بارے میں ابنِ قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی بات فرمائی ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر خواتین کو قاضی بنانا جائز ہوتا تو نبی کریم ﷺ، خلفاء راشدین اور مابعد کے اسلامی حکمرانوں میں سے کسی نے عورت یہ کو ذمہ داری سونپی

---

(۱) سورۃ النساء ۴/ ۳۴

(۲) کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال، علاؤالدین علی المتقی ابن حسام الدین الہندی، دار الاشاعت، کراچی ۶/ ۷۹

ہوتی ایسا انہوں نے نہیں کیا اگر انہوں نے ایسا کیا ہوتا تو تاریخِ اسلامی اس سے بھری ہوئی ہوتی جب کہ تاریخِ اسلامی میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔[1]

۶۔ صالح / پرہیز گار:

قاضی پر لازم ہے کہ وہ صالح و نیک اور خوفِ خدا رکھنے والا ہو کیوں کہ جمہور فقہاء کے نزدیک فاسق کو قاضی لگانا جائز نہیں ہے اور اس کا فیصلہ بھی نافذ نہیں ہو سکتا۔ لیکن احناف کے نزدیک فاسق قاضی کا تقرر گناہ ہے لیکن اس کا فیصلہ نافذ ہو جائے گا بشرطیکہ وہ فیصلہ کلام اللہ احادیث رسول اللہ ﷺ اور اجماع امت کے خلاف نہ ہو۔[2]

۷۔ عادل / انصاف پسند:

اسلامی نظام کی حامل حکومت کی بنیاد عدل و انصاف پر مبنی ہوتی ہے اس لیے اسلامی ریاست میں قاضی القضاء کا منصب جس شخص کو سونپا جائے اس کا عدل مشہور ہو عام مسلمان بھی اس کے عادل ہونے کو تسلیم کرتے ہوں آسان الفاظ میں مسلمانوں کے چیف جسٹس کے لیے عادل ہونا انتہائی ضروری ہے۔

۸۔ تعلیم یافتہ / عالم:

اسلام میں چیف جسٹس کا عالم ہو نا فقیہ ہونا ضروری ہے، بلکہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک تو مجتہد بھی ہو۔ یہ تو احناف کا شکریہ کا ادا کرنا چاہئے کہ انہوں نے ایسے شخص کے لیے راستہ نکال دیا کہ جو مجتہد نہیں لیکن مجتہدین کے اقوال کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس سے استفادہ کر کے فیصلہ صادر کر سکتا ہے اس کے لیے جائز ہے کہ وہ قاضی القضاء کے منصب پر بیٹھے۔

مجتہد کے لیے لازمی علوم:

مجتہد کون ہے؟ اس کے لیے کون کون سے علوم کا عالم ہونا ضروری ہے صرف قانون کا ماہر مجتہد نہیں کہلاتا قانون کے ساتھ ساتھ قرآن کا علم، حدیث کا علم، اجتہاد اور قیاس کے شرعی قواعد کا علم، عربی زبان کا علم قواعد نحوی اور صرفی کے ساتھ، مسائل کے استنباط کا علم، ان علوم کو جاننے والا ہی مجتہد کہلاتا ہے۔

---

(۱) المغنی لابنِ قدامة، ابو محمد موفق الدين عبد الله بن أحمد بن محمد بن قدامة الجماعيلی المقدسي ثم الدمشقي الحنبلي، الشهير بابن قدامة المقدسي، مكتبة القاهرة، ۱۹۶۸ء، ۲/ ۳۶

(۲) بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع، علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن احمد الكاسانی الحنفی، دار الکتب العلمية، ط، ثاني، ۱۹۸۶ء، ۷/ ۳

۹۔ سلیم الاعضاء:

اسلامی ریاست یا مروجہ جمہوری ریاست میں قاضی القضاء جس کو چیف جسٹس کہا جاتا ہے کا منصب نہایت اہمیت کا حامل منصب ہے اس لیے چیف جسٹس کا سلیم الاعضاء ہونا ضروری ہے ایک بہرہ، گونگا، لنگڑا لولا، اندھا شخص اس منصب کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔

یہ وہ بنیادی اوصاف ہیں جو ایک عدلیہ کے سربراہ کے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں لازمی قرار دیئے گئے ہیں اگر ان اوصاف کے لحاظ کے بغیر کوئی جج مقرر کر دیا تو پھر ایسے جج سے انصاف اور قوانین کے نفاذ کا تصور ممکن نہیں۔

مقننہ میں تقرر کے بنیادی اصول:

مقننہ سے مراد پارلیمان یا مجلسِ شوریٰ ہے اصل میں مقننہ کا سربراہ حاکم وقت ہوتا ہے لیکن مقننہ کے سربراہ سے پہلے مجلسِ شوریٰ کے ارکان کی کیا صفات اسلام نے بیان کی ہیں جن کی بنیاد پر ان کا تقرر بحثیتِ رکن مجلسِ شوریٰ کیا جاتا ہے ان کا بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اراکین مجلس شوریٰ کے تقرر کے اصول:

اسلام میں خلیفہ کا انتخاب مجلس شوریٰ کے ذریعے کیا جاتا ہے اس لیے اس مجلس کے اراکین یقیناً اہلِ حل وعقد ہی ہوں گے نہ کہ ہر شخص اس کا رکن ہو گا۔ اس کے لیے کچھ اصول اسلام نے وضع کیے ہیں۔

۱۔ ان کو اسلامی نظام سیاست اور مملکت سے آگاہی ہو اور صاحبِ بصیرت ہوں۔

۲۔ امانتدار ہوں دیانتدار ہوں۔

شوریٰ کے ارکان ایسے افراد ہوں جن کی دیانت داری وامانت داری کے چرچے ہر سو ہوں اسلام نے اس کے لیے کوئی خاص لوگوں کا تعین نہیں کیا بلکہ ہر زمانے کے اہل حل و عقد پر چھوڑ دیا ہے۔

مجلسِ شوریٰ میں خواتین کی رکنیت:

مجلسِ شوریٰ میں خواتین کی نمائندگی ہو سکتی ہے کہ نہیں آج کل کے زمانے کے اعتبار سے بڑا اہم سوال اٹھایا جاتا ہے۔ اس بارے میں علماء سیاست یہ فرماتے ہیں کہ خواتین کو مجلس شوریٰ میں شامل کیا جا سکتا ہے بطور دلیل کہتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ نے بسا اوقات خواتین کے ساتھ مشورہ کیا ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا مشہور واقعہ ہے صلح حدیبیہ کے موقع پر کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو فرمایا کہ قربانی کر لیں اور اس کے بعد

احرام کھول دیں لیکن تین مرتبہ اعلان کے باوجود کوئی بھی نہ اٹھا، یہ ایک غیر معمولی بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ایک اشارے پر جان قربان کر دینے والے صحابہ رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کے اعلان کے باوجود اٹھ نہیں رہے تھے تو رسول اللہ ﷺ اندر تشریف لے گئے، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے اظہار فرمایا جس پر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے مشورہ دیا اللہ کے رسول ﷺ آپ مزید کچھ کہے بنا اپنے جانوروں کو قربان کر کے حلق والے کو بلائیں اور حلق کرالیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسی مشورے پر عمل فرمایا۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کو یہ عمل کرتے مشاہدہ کیا تو سب ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر قربانی اور حلق کرنے لگے۔[1]

اس واقعے میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے مشورے پر آپ ﷺ نے عمل فرمایا۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلیفہ کے انتخاب کے لیے قائم کردہ کمیٹی میں حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اعلان کیا کہ میں اپنی خلافت سے دستبردار ہو جاتا ہوں تاکہ بنفسِ نفیس عوام کی آراء لیکر کسی ایک کو امیر مقرر کر سکوں جس پر باقی ارکانِ کمیٹی نے ان کی یہ بات مان لی تو حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تین دن مسلسل عوام کی رائے لیتے رہے۔ چنانچہ تاریخ میں ہے کہ:

ثم نهض عبد الرحمٰن بن عوف رضیٰ الله تعالیٰ عنه یستشیر الناس فیهما ویجمع رای المسلمین ....حتیٰ خلص الیٰ النساء المخدّرات فیٰ حجاب هنّ[2]

ترجمہ: پھر اٹھے عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ان دونوں کے متعلق لوگوں سے مشورہ شروع کیا اور لوگوں کی آراء اکھٹی کیں۔۔۔ حتیٰ کہ باپردہ خواتین سے بھی ان کے پردے میں رائے لینے گئے۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خواتین کو مجلسِ شوریٰ کا ممبر بنایا جا سکتا ہے۔

شوریٰ میں غیر مسلم کی شمولیت:

اسلامی ریاست کی شوریٰ میں غیر مسلم کو رکن بنایا جا سکتا ہے کہ نہیں؟ اس کو بھی دشمنانِ اسلام موضوعِ بحث بناتے ہیں اس پر قرآن کریم کی ایک آیت ہے جس میں ارشاد ہے کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا...﴾[3]

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الشروط، بَاب إِذَا اشْتَرَطَ فِي الْمُزَارَعَةِ إِذَا شِئْتُ أَخْرَجْتُكَ، حدیث ۲۷۳۰، ۷/۱۰۱

(۲) البدایۃ والنھایۃ، أبو الفداء إسماعیل بن عمر بن کثیر القرشي البصري ثم الدمشقي، دار ھجر للطباعۃ والنشر والتوزیع والإعلان، ط، اولیٰ، ۱۹۹۷ء، ۱۰/۲۱۱

(۳) سورۃ اٰلِ عمران ۳:۱۱۸

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے دوسرے لوگوں (غیر مسلموں) میں سے کسی کو راز نہ دو، کیونکہ وہ تمہاری خرابی میں کسی قسم کی فروگذاشت نہیں چھوڑتے۔

اس آیت سے بعض لوگ استدلال کرتے ہیں کہ شوریٰ کے اندر غیر مسلموں کو شریک کرنا درست نہیں۔ مگر اس آیت سے یہ استدلال کرنا موزوں نہیں کیونکہ مفسرین نے مذکورہ بالا آیت کے تحت جو ارشاد کیا ہے جس سے اس آیت کے مصداق وہ غیر مسلم ہیں جو مسلمانوں کی دشمنی پر اترے ہوئے متعصب قسم کے غیر مسلم ہیں ان کو اپنا راز دینا مناسب نہیں۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے تحت جو روایتیں نقل کی ہیں ان میں کچھ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ بعض مسلمان قدیم دوستیوں کی وجہ سے یہودیوں سے ایسا تعلق رکھتے تھے کہ ان پر مسلمانوں کے راز بھی افشاں ہو جاتے تھے۔ کچھ روایتوں میں ہے کہ اس آیت میں مسلمانوں کے لیے منافقین سے رازدارانہ تعلقات رکھنے سے منع فرمادیا ہے[1]۔

مطلب یہ کہ جو مسلمانوں کے دشمن ہوں انہیں شوریٰ میں کیونکر لیا جائے ہاں البتہ معتدل اور پر امن باشندوں کو شوریٰ میں لیے جانے کو فقہاء جائز قرار دیتے ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں بعض مرتبہ اپنی مجلسِ شوریٰ بلائی تو اس میں کچھ ذمی بھی بلائے گئے جس کو علامہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ یوں بیان کرتے ہیں کہ :

وفيه دليل علىٰ ان لا باس باحضار بعض اهل الكتاب مجلس الشورىٰ،فان النصرانى الّذى قال ما قاله قد كان حضر مجلس عمرللشورىٰ،و لم ينكر عليه[2]

ترجمہ: اس میں دلیل ہے کہ کوئی مضائقہ نہیں کہ بعض اہلِ کتاب کو مجلسِ شوریٰ میں بلایا جائے، کیونکہ اس نصرانی نے جو کچھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا وہ اس مجلس میں کہا جو کہ اس مجلسِ شوریٰ میں موجود تھا جس پر کوئی روک ٹوک نہیں کی گئی۔

یہ بظاہر غیر مسلموں کے کچھ معاملات کو طے کرنے کے لیے تھا جس کے لیے سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے غیر مسلموں کو مجلس شوریٰ میں شامل کیا تھا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے امور طے کرنے کے لیے غیر مسلموں کو مجلس شوریٰ میں بلایا جاسکتا ہے

---

(۱) روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني، شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني الألوسي، دار الكتب العلمية، بيروت، ط، اولیٰ، ۱۴۱۵ھ، ۲/ ۲۵۳

(۲) مبسوط، محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي، دار المعرفة، بيروت، ۱۹۹۳ء، ۲/ ۲۴

اسی طرح مباحات میں غیر مسلم شہریوں کو مجلسِ شوریٰ میں شامل کر لیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

اسلامی ریاست کے مقننہ کے سربراہ کے اوصاف:

اسلامی ریاست میں حاکم یا خلیفہ ہی مقننہ کا سربراہ ہوتا ہے اسلامی ریاست میں خلیفہ ہی اسلام کے مکمل نفاذ اور پوری دنیا تک اسلام کو پہنچانے کا واحد ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہی مسلمانوں کا 'امام' ہے اور 'امیر المؤمنین' بھی۔ اس لیے سربراہ ریاست یا مقننہ کے سربراہ میں یہ صفت ہونا ضروری ہے کہ وہ ممتاز شخصیت و باکردار شخصیت ہو وہ علم و عمل، صلاحیت و قابلیت، عدالت و دیانت ہر اعتبار سے ایک ممتاز شخص ہو۔ اسلامی مملکت نظریہ اور اصولوں کی پاسدار مملکت کہلاتی ہے لہٰذا مملکت کا سربراہ ایمان اور اسلام (مسلمان) کے اعلیٰ درجے کا حامل ہو، یا کم سے کم مومن والی بنیادی صفات کا حامل ہو۔

لہٰذا جو شرائط ایک خلیفہ کے لیے اسلام کی تعلیمات میں ہیں ان کا ذکر بعض مفسرین نے تفصیلاً اور بعض نے اجمالاً کیا ہے۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ تفصیلاً بیان کرتے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں۔

ا۔ اسلام:

اللہ رب العزت کا ارشاد گرامی ہے

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰه وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلا﴾[1]

اے ایمان والو! اللہ کی فرمانبرداری کرو اور رسول کی فرمانبرداری کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے حاکم ہوں، پھر اگر آپس میں کسی چیز میں جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر یقین رکھتے ہو، یہی بات اچھی ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت بہتر ہے۔

اس آیت میں اولی الامر کے لیے مسلم ہونا بنیادی امر ہے۔

دوسری جگہ اللہ کا فرمان ہے کہ:

---

(۱) سورۃ النساء ۴:۵۹

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيَاتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾[1]

اے ایمان والو! اپنوں کے سوا کسی کو بھیدی نہ بناؤ کہ وہ (دشمن لوگ) تمہاری خرابی میں قصور (کمی) نہیں کرتے، جو چیز تمہیں تکلیف دے وہ انہیں پسند آتی ہے ان کے مونہوں سے دشمنی نکل پڑتی ہے اور جو ان کے سینے میں چھپی ہوئی ہے وہ بہت زیادہ ہے، ہم نے تمہارے لیے نشانیاں بیان کر دی ہیں اگر تم عقل رکھتے ہو۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ مسلمانوں پر پابندی ہے کہ وہ غیر مسلموں کو اپنے امور میں دخل اندازی نہ کرنے دیں۔

ایک اور جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾[2]

کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے ایسے لوگوں کو جدا ہی نہیں کیا جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا اور اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے سوا کسی کو دلی دوست نہیں بنایا، اور اللہ تمہارے سب کاموں سے باخبر ہے۔

اسلامی حکومت کا مقصد دینِ اسلام کا نفاذ ہے اور اسلام کا دفاع ہے۔ اب جو خود مسلمان نہیں ہو گا وہ اس دین کو کیسے نافذ اور قائم کر سکتا ہے۔ اسی طرح جو قوم کی بنیادی نظریات سے ہی انکاری ہو یا نہ مانتا ہو وہ کیسے ان کا سربراہ بن سکتا ہے۔

۲۔ بلوغت :

بلوغت سے پہلے انسان ناتواں طفل کہلاتا ہے جس کا ذہنی شعور ناپختہ ہوتا ہے جسم ناتواں ہوتا ہے جو یہ بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہوتا۔ قرآنِ کریم میں بھی نابالغ بچوں کو ان کے اپنے مال میں تصرف کرنے سے روکا گیا ہے۔ جیسے اللہ رب العزت کا فرمان ہے کہ:

---

(۱) سورۃ اٰلِ عمران ۳:۱۱۸

(۲) سورۃ التوبہ ۹:۱۶

﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا﴾ (۱)

ترجمہ: اور اپنے وہ مال بے سمجھوں کے حوالے نہ کرو جنہیں اللہ نے تمہاری زندگی کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے، البتہ ان مالوں سے انہیں کھلاتے اور پہناتے رہو اور انہیں نصیحت کی بات کہتے رہو۔

ظاہر ہے کہ اگر بچہ اپنے مال میں تصرف نہیں کر سکتا تو پورے ملک کے معاملات میں کیسے تصرف کر سکتا ہے۔ اس لیے کسی بچے کو سربراہ نہیں بنایا جا سکتا۔

۳۔ عاقل و دانا:

عقلمند ہو ایک غیر عاقل جس کو اپنا شعور نہیں ہوتا تو ایسے شخص کا سربراہِ مملکت کے طور پر تقرر کرنا غیر دانشمندانہ کام ہے۔ نادان اور مجنوں کو قرآنِ کریم میں اپنے مال میں تصرف سے منع کیا ہے۔

﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا﴾ (۲)

ترجمہ: اور اپنے وہ مال بے سمجھوں کے حوالے نہ کرو جنہیں اللہ نے تمہاری زندگی کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے، البتہ ان مالوں سے انہیں کھلاتے اور پہناتے رہو اور انہیں نصیحت کی بات کہتے رہو۔

ظاہر ہے کہ اگر بے سمجھوں کو ان کے مال حوالہ کرنے سے منع فرمایا ہے تو پورے ملک کا نظام کیسے حوالہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے سربراہ کا عقلمند ہونا ضروری ہے کیوں کہ ملک کے امور چلانے کے لیے عقل اور دانائی بنیادی ضرورت ہے ملک کا نظم و نسق کو سمجھنا عاقل اور دانا شخص کا کام ہے۔

۴۔ آزاد:

یہ بات کہ سربراہ کا آزاد ہونا یعنی غلام کو سربراہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ایک غلام کیسے آزادانہ فرائض کی ادائیگی کر سکتا ہے جب کہ وہ خود کسی دوسرے کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ ہر وقت کا ملازم ہوتا ہے۔

---

(۱) سورۃ النساء ۴:۵

(۲) سورۃ النساء ۴:۵

۵۔رجولیت(مرد):

سربراہِ ریاست کا مرد ہونا ضروری ہے کیوں کہ خواتین اسلامی تاریخ میں کبھی سربراہِ ریاست کے منصب پر فائز نہیں ہوئیں۔اس پر دلیل یہ دی جاتی ہے۔اللہ رب العزت کا ارشاد ہے۔

﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ﴾۔[۱]

ترجمہ:مرد خواتین پر حاکم ہیں۔

آپ ﷺ کے فرامین سے ظاہر ہوتا ہے آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ:

((لَن يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمْ امْرَأَةً))[۲]

ترجمہ:ہرگز کامیاب نہیں ہوگی جس نے اپنے اوپر کسی خاتون کو امیر بنالیا ہو۔

یہ بات رسول اللہ ﷺ نے اس وقت کہی جس وقت ایران میں ایک عورت کو انہوں نے اپنا سربراہ بنالیا تھا۔

نیز آنحضرت ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((إذا كان أمراؤكم خياركم وأغنياؤكم سمحاءكم وأموركم شورىٰ بينكم فظهر الأرض خير لكم من بطنها------الخ))[۳]

ترجمہ:جب ہوں تم میں سے بہترین لوگ تمہارے امیر،اور تمہارے مالدار سخاوت والے ہوں ،اور تمہارے امور آپس کی بات چیت (شوریٰ) سے حل ہوتے ہوں،پس زمین کی کمر تمہارے لیے زمین کے پیٹ (قبر) سے بہتر ہے،اور جب تم میں سے بدترین لوگ تمہارے امیر بن جائیں اور دولت مند کنجوس ہوں ،تمہارے امور عورتوں کے ہاتھ میں ہوں ،پس پھر زمین کے اندر جانا(قبر) بہتر ہے تمہارے واسطے زمین کے اوپر رہنے سے۔

اسلام نے حکومت یا سربراہی کو امامت سے تعبیر کیا ہے اور امامت کی قسمیں دو ہیں۔

۱۔امامت صغریٰ یعنی نماز کی امامت

۲۔امامت کبریٰ:حکومت کی سربراہی

---

(۱) سورۃ النساء ۴/ ۳۴

(۲) صحیح بخاری،باب کتاب النبی ﷺ الیٰ کسریٰ وقیصر حدیث نمبر ۴۴۲۵،۲/ ۵۲۲

(۳) جامع ترمذی،کتاب الفتن،باب ۷۸،حدیث نمبر ۲۲۶۶،۲/ ۵۲۹

امامت صغریٰ یعنی نماز کی امامت یہ اجماعی طور پر طے ہے کہ خاتون مردوں کی نماز میں امامت نہیں کروا سکتی جس سے یہ بات مکمل طور پر ذہن نشین ہوتی ہے کہ جب عورت امامت صغریٰ نہیں کرا سکتی تو امامت کبریٰ کے منصب پر کیسے فائز ہو سکتی ہے۔ فقہاء اسلام اس پر متفق ہیں۔ اس کے متعلق ابنِ قدامہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول پہلے بیان کیا ہے۔ ابنِ قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی بات کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اگر خواتین کو قاضی بنانا جائز ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ،خلفاء راشدین اور بعد میں آنے والے اسلامی حکمرانوں میں سے کسی نے عورت کو ذمہ داری سونپی ہوتی کسی نے بھی اس طرح نہیں کیا اور نہ ہی تاریخ اسلامی میں اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔ (۱)

۶۔ نیک وصالح:

نیک اور صالح لوگ ہی مملکت کے سربراہ بننے کے اہل ہیں اللہ رب العزت کا فرمان ہے کہ:

﴿ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ﴾ (۲)

ترجمہ: ار ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔

اس لیے سربراہ مملکت کے لیے اہلیت کی بنیادی شرائط میں سے ہے کہ وہ نیک اور صالح ہو نیز نیک اور صالح کے متضاد الفاظ ظالم اور فاسق کے ہیں جب کہ ظالم لوگ مسلمانوں کی امامت اور قیادت کے مستحق نہیں ہیں اس کے متعلق اللہ رب العزت کا فرمان ہے کہ:

﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ رَبُّه بِكَلِمَاتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ﴾ (۳)

ترجمہ: اور جب ابراہیم علیہ السلام کو اس کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا تو اس نے انہیں پورا کر دیا، فرمایا بے شک میں تمہیں سب لوگوں کا پیشوا بنادوں گا، کہا اور میری اولاد میں سے بھی، فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا (البتہ میرا وعدہ ظالموں کے لیے نہیں ہو گا)۔

خدا سے غافل لوگوں اور مسفرین و مفسدین کی اطاعت جائز نہیں۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے۔

---

(۱) المغنی لابنِ قدامۃ، ابو محمد موفق الدین عبد اللہ بن أحمد بن محمد بن قدامۃ الجماعیلی المقدسي ثم الدمشقي الحنبلي، الشهير بابن قدامۃ المقدسي، مکتبۃ القاهرۃ، ۱۹۶۸ء، ۲/ ۳۶

(۲) سورۃ الانبیاء: ۲۱: ۱۰۵

(۳) سورۃ البقرۃ ۲: ۱۲۴

﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَه عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ اَمْرُه فُرُطًا﴾ (۱)

ترجمہ: اور اس شخص کا کہنا نہ مان جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور اپنی خواہش کے تابع ہو گیا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے۔

نیز قرآن کریم میں دوسرے مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿وَلَا تُطِيْعُوا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ (۲)

ترجمہ: اور ان حد سے نکلنے والوں کا کہا مت مانو۔

﴿اَلَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ﴾

ترجمہ: جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

قرآن کریم میں ایک اور جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

﴿يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾ (۳)

ترجمہ: اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہارے خاندان اور قومیں جو بنائی ہیں تاکہ تمہیں آپس میں پہچان ہو، بے شک زیادہ عزت والا تم میں سے اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیز گار ہے، بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا خبر دار ہے۔

ان آیات کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ فاسق کی فرمانبرداری لازم نہیں ہے نہ ہی وہ اعزاز اور اکرام کے لائق ہے پھر کیوں کر وہ ریاست کے سربراہ ہونے کا مستحق ہو سکتا ہے۔

۷۔عادل:

عدالت بھی ایک شرط ہے عدالت کا معنیٰ ہے انسان اپنی زندگی میں احکاماتِ اسلامی کا کاربند رہے اور خطاؤں سے پرہیز کرے یعنی اللہ کے مقرر کردہ احکامات کی بجاآوری میں انصاف کرے تو وہی شخص رعایا کے ساتھ بھی عدل وانصاف والا معاملہ کرے گا اور وہی شخص عدالت

---

(۱) سورۃ الکہف ۱۸:۲۸

(۲) سورۃ الشعراء ۲۶:۱۵۱، ۱۵۲

(۳) سورۃ الحجرات ۴۹:۱۳

میں سب سے افضل ہو گا۔ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے تو اپنی کتاب السیاسۃ الشرعیۃ کے شروع میں ہی اس پر مفصل بحث کی ہے عدالت میں بھی جو شخص سب سے افضل ہو اسی کو امیر بنانا ضروری ہے وہ استدلال کرتے ہیں حضرت عبد اللہ بن عبّاس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے:

((من استعمل رجلا من عصابة وفی تلک العصابة من هو ارضی لله منه فقد خان الله وخان رسوله وخان المؤمنين))[1]

ترجمہ: جس نے کسی جماعت پر کسی شخص کو مقرر کیا جب اس جماعت میں اس سے زیادہ اللہ کو راضی کرنے والا شخص موجود ہو تو اس نے اللہ اور رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی۔

۸۔ عالم:

اسلام میں تمام فقہاء کے نزدیک یہ بات ضروری ہے کہ وہ عالم ہو فقیہ ہو بلکہ بعض ائمہ کے نزدیک تو ہے کہ اسے بذاتِ خود مجتہد بھی ہونا چاہیئے۔ علامہ ماوردی رحمۃ اللہ علیہ الاحکام السلطانیہ میں یہی فرماتے ہیں[2] بہر حال اب کے آئمہ کا کہنا ہے کہ مجتہد نہ ہو لیکن اتنا علم جانتا ہو جس سے اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں حکمرانی کرتا ہو۔ مجتہدین کے اقوال کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو اس سے استفادہ کرنے کی صلاحیت ہو۔

۹۔ سلیم الاعضاء:

سربراہِ مملکت کا سلیم الاعضاء (اعضاء صحیح سلامت ہوں) ہونا ضروری امر ہے ایک بہرہ، گونگا، لنگڑا لولا، اندھا شخص اس منصب کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔

۱۰۔ شجاع اور معاملہ فہم:

دلیر اور بہادر ہونا اس لیے ضروری ہے کہ ایک بزدل شخص نہ ملک کا دفاع کر سکتا ہے نہ ہی امن قائم کر سکتا ہے اسی طرح جو شخص معاملہ فہم نہ ہو وہ نظم و نسق قائم نہیں رکھ سکتا۔[3]

---

(۱) بدائع الصنائع، ۷/ ۳

(۲) احکام السلطانیہ، امام ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب البصری ماوردی، مترجم سید محمد ابراہیم ایم اے، قانونی کتب خانہ لاہور، ۱/ ۱۶۳

(۳) الجامع لأحكام القرآن، أبو عبد الله محمد بن أحمد بن أبي بكر بن فرح الأنصاري الخزرجي شمس الدين القرطبي، دار الكتب المصرية - القاهرة، ط، ثاني، ۱۹۶۴ء، ۱/ ۲۷۰

یہ وہ بنیادی اوصاف ہیں جو ایک اسلامی ریاست کے سربراہ کے لیے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں لازمی قرار دیئے گئے ہیں جس کے اندر یہ اوصاف پائے جائیں گے وہ اہل ہو گا کہ وہ اسلامی ریاست کا سربراہ بن سکے لیکن صرف یہ اہلیت ہونا کافی نہیں بلکہ اسلام نے سربراہِ ریاست کے تقرر کا باقاعدہ طریقہ کار وضع کیا ہے ۔

اسلامی ریاست کے سربراہ کے تقرر کا طریقہ کار:

مذکورہ بالا بیان کردہ اہلیت کی شرائط پر پورا اترنے کے باوجود اسلام کا یہ حکم ہے کہ سربراہِ ریاست کا تقرر شوریٰ کے ذریعے عمل میں لایا جائے۔ اس اصول کے دو حصے ہیں ایک یہ کہ مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ خود پر کوئی امیر مقرر کریں جسے فقہ اور عقائد کی کتابوں میں نصب الامام کہا گیا ہے۔ جس وقت مسلمانوں کا امیر کوئی بھی نہ ہو اس وقت نصب الامام لازم ہے۔ نیز مسلمانوں کو چاہیئے کہ مسلمان اپنے اوپر ایسے امام و امیر بنائیں جو مذکورہ بالا اوصاف و شرائط سے متصف ہوں۔

دوسرا حصہ یہ ہے کہ امیر کا تقرر شوریٰ کے ذریعے ہونا ضروری ہے نہ کہ کوئی زبردستی امیر بن جائے یا کوئی اہل حل و عقد سے مشورہ لیے بغیر دو چار لوگوں کے ذریعے امیر بن بیٹھے۔

فرمانِ خداوندی ہے کہ:

﴿وامرھم شوریٰ بینھم﴾ [1]

"ان کے امور ان کے درمیان مشاورت سے مقرر ہوتے ہیں"

اگر دیکھا جائے تو واضح دلیل خلیفہ کا تقرر شوریٰ کے ذریعے کرنے کی یہ ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے کوئی بھی نائب نامزد نہیں کیا بلکہ اس کا انتخاب اور تقرر عام مسلمانوں پر چھوڑ دیا اگر عام مسلمانوں کو انتخاب نہ کرنا ہوتا تو آپ ﷺ خود کسی کی نامزدگی کے بعد دنیا سے تشریف لے جاتے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

---

(۱) سورۃ الشوریٰ ۴۲ :۳۸

((لَقَدْ هَمَمْتُ أَوْ أَرَدْتُ أَنْ أُرْسِلَ إِلَى أَبِي بَكْرٍ وَابْنِهِ وَأَعْهَدَ أَنْ يَقُولَ الْقَائِلُونَ أَوْ يَتَمَنَّى الْمُتَمَنُّونَ ثُمَّ قُلْتُ يَأْبَى اللَّهُ وَيَدْفَعُ الْمُؤْمِنُونَ أَوْ يَدْفَعُ اللَّهُ وَيَأْبَى الْمُؤْمِنُونَ))[1]

ترجمہ: البتہ تحقیق میں نے ارادہ کیا کہ میں ابو بکر اور ان کے صاحبزادے کو پیغام بھیجوں تاکہ ان سے عہد لے سکوں پھر کہامیں نے کہ اللہ ربّ العزت بھی انکار فرمائیں گے اور مسلمان بھی (ان کے علاوہ دوسرے کی خلافت کو) منع کر دیں گے۔

جس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے خلیفہ کا انتخاب لوگوں کی رائے پر چھوڑ دیا۔ اللہ کے رسول ﷺ مطمئن تھے کہ مسلمان حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور کو خلیفہ نہیں بنائیں گے اس لیے خود نامزدگی ضروری نہیں سمجھی۔

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے کہ انہوں نے بھی مرض الموت میں ایک کمیٹی قائم کی اس کمیٹی کو سونپا گیا خلیفہ کے انتخاب کو۔ لھٰذا یہ ضروری ہے کہ شوریٰ ہی خلیفہ کو منتخب کرے۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب المرضیٰ، بَاب قَوْلِ الْمَرِيضِ إِنِّي وَجِعٌ أَوْ وَا رَأْسَاهُ أَوْ اشْتَدَّ بِي الْوَجَعُ وَقَوْلِ أَيُّوبَ عَلَيْهِ السَّلَام {أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ} حدیث ۵۶۶۶، ۱۴/۲۷۷

فصل دوم:

جمہوری ریاست میں اداروں کے سربراہان کے تقرر کے اصول

جمہوری ریاست میں اداروں کے سربراہان کے تقرر کے اصول:

کسی بھی ریاست میں اداروں کے سربراہان کے تقرر کے اصول ریاست کا دستور، آئین طے کرتا ہے۔ دستور کسی ریاست اور معاشرے میں بنیادی قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ضابطہ، قوم کی دیرینہ روایات و اقدار، اس کے سیاسی اور اجتماعی عزائم اور منزلِ مراد کا آئینہ ہوتا ہے۔ یہ اس تصورِ حیات، اجتماعی نظام اور انفرادی زندگی میں قوم کی راہنمائی کرتا ہے۔

جس طرح پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ جمہوری ریاست کے بنیادی ادارے تین ہیں

۱۔ عدلیہ ۲۔ مقننہ ۳۔ انتظامیہ

۱۔ عدلیہ

عدلیہ ایک ادارہ ہے اور عدلیہ کے سربراہ کو چیف جسٹس کہا جاتا ہے یعنی قاضی القضاء چونکہ یہاں عدلیہ کے سربراہ کی بات کرنی مقصود ہے اور عدلیہ کی سب سے بڑی عدالت عدالتِ عظمیٰ کہلاتی ہے اس لیے ذیل میں اسی عدالتِ عظمیٰ کی تفصیل بیان کی جارہی ہے اور عدلیہ کے سربراہ کے تقرر کے اصول بیان کیے جارہے ہیں۔

عدالت عظمیٰ:

عدالت عظمیٰ پاکستان کے عدالتی نظام کی سب سے بڑی عدالت ہے۔ اس کی موجودہ تشکیل ۱۹۷۳ کے آئین کے حصہ ۷ کے مطابق ہوئی ہے۔

عدالت عظمیٰ ایک چیف جسٹس، ۱۷ ججز اور ۲ ایڈ ہاک ججز پر مشتمل ہے جس کی منظوری صدر پاکستان وزیر اعظم پاکستان کی طرف سے نامزد نمائندوں سے ہوتی ہے۔

عدالتِ عظمیٰ کی آئینی تشکیل :

موجودہ عدالت عظمیٰ کی تشکیل ۱۹۷۳ء آئین پاکستان کے حصہ ۷ کی شق ۱۷۶ سے ۱۹۱ سے ہوئی ہے ان شقوں میں عدالت عظمیٰ کے اختیارات، نامزدگی، ذمہ داریاں، قواعد بیان کئے گئے ہیں۔

آرٹیکل ۱۷۶ سپریم کورٹ کی تشکیل کے بارے میں ہے۔

آرٹیکل ۱۷۷ عدالت عظمیٰ کے جج صاحبان کے تعین کے بارے میں ہے۔

عدالت عظمیٰ (سپریم کورٹ) کے جج صاحبان کا تعین:

آئین پاکستان میں وضاحت کے ساتھ درج ہے کہ :

جج صاحبان کے تعین کے لیے لازمی ہے کہ وہ:

پاکستانی ہو اور بیک وقت ۵ سال لگاتار یا مختلف وقتوں میں ۵ سالہ مدت تک عدالتِ عالیہ (ہائی کورٹ) کا جج رہا ہو۔

اسی طرح کم سے کم ۱۵ سال لگاتار یا مختلف اوقات میں ۱۵ سال کی مدت تک ہائی کورٹ میں وکالت کی ہو۔

علاوہ ازیں ایڈہاک جج صاحبان کا تعین چیف جسٹس کی سربراہی میں کمیشن تجویز دیتا ہے جسے صدرِ پاکستان سے منظور کرانا ہوتا ہے عدالت عظمیٰ (سپریم کورٹ) کے جج صاحبان کی مدت ملازمت ۶۵ سال کی عمر ہے اس مدت سے پہلے بھی ملازمت سے الگ ہو سکتے ہیں یا انہیں الگ کیا جا سکتا ہے جس کا طریقہ کار آئین میں درج ہے۔

اسی طرح ججوں کے تقرر کے نظام کو ہر سطح کے 'صوابدیدی اختیار' ختم کرنے کی جدوجہد کی گئی ہے۔ سب سے سینئیر جج کے چیف جسٹس بننے کے اصول کے تسلیم کیے جانے اور اس اہم ترین تقرری میں انتظامیہ کی مداخلت کو ختم کر دیا گیا ہے۔ نئے ججوں کے تقرر کے لیے برتری عدالت کو حاصل ہے، جس میں عدالتی کمیشن کا سربراہ چیف جسٹس آف پاکستان ہو گا۔ اس میں سپریم کورٹ کے دو سب سے سینئیر جج اور سپریم کورٹ کا ایک ریٹائرڈ چیف جسٹس یا جج ہو گا، جسے چیف جسٹس آف پاکستان باقی دو ججوں کے مشورے سے مقرر کریں گے۔ باقی تین افراد وزیر قانون، اٹارنی جنرل اور سپریم کورٹ کا ایک سینئیر ایڈووکیٹ جسے پاکستان بار کونسل نامزد کرے گی۔ اس طرح سات میں سے چار جج ہوں گے۔ یہ عدالتی کمیشن، نئے ججوں کے لیے جو نام تجویز کریں گے، وزیر اعظم اپنے صوابدیدی اختیار سے تقرر کے لیے صدر کو نہیں بھیجیں گے، بلکہ ایک پارلیمانی کمیٹی کو بھیجیں گے، جس میں چار ارکان حکومتی پارٹی سے اور چار حزبِ اختلاف سے ہوں گے۔ نیز اُن میں سے چار قومی اسمبلی اور چار سینٹ کے ارکان ہوں گے، جنھیں ۱۴ دن کے اندر اندر تجویز کردہ ناموں کی توثیق کرنا ہو گی اور صرف تین چوتھائی اکثریت سے انہیں نام رد کرنے کا اختیار ہو گا۔ گویا کہ اس طرح ہر سطح پر صوابدیدی اختیار کو ختم کر کے اداراتی مشاورت کا نظام قائم کیا گیا ہے۔ نیز نئے ججوں کے ناموں کا اوّلین انتخاب عدلیہ کے توسط سے ہو گا۔[1]

عدالت عظمیٰ کے قانونی مشیر اور وکلاء :

اس کے علاوہ عدالت عظمیٰ کے اپنے قانونی مشیر اور وکلاء ہوتے ہیں جن کا کام تحقیق کرنا اور دائر درخواستوں پر نظر ثانی کرنا ہوتا ہے۔

---

(۱)۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، آرٹیکل ۱۷۷، ص ۱۰۵

۲۔ مقننہ:

مقننہ وہ جماعت یا مجلس ہوتی ہے جو قوانین کو بناتی ہے، اس میں ترامیم کرتی ہے یا قانون کو ختم کر سکتی ہے۔ مقننہ کے پاس بہت سے اختیارات ہوتے ہیں جن کو بروئے کار لا کر یہ قانون سازی کرتی ہے۔ پاکستان میں مقننہ دو حصوں میں منقسم ہے، ایک کو ایوان زیریں یا قومی اسمبلی کہتے ہیں اور دوسرے کو ایوان بالا یا سینٹ کہتے ہیں۔ مقننہ سے مراد قانون ساز ادارہ ہے جو کہ درج ذیل ذیلی اداروں کے ذریعے وجود میں آتا ہے:

ایوان زیریں یا قومی اسمبلی:

ملک میں منعقد ہونے والے عام انتخابات کے نتیجے میں وفاقی سطح پر قائم ہونے والا قانون سا ز ادارہ جس کے اراکین براہ راست عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوتے ہیں۔[1]

ایوانِ زیریں (قومی اسمبلی) کے رکن کے لیے شرائط:

اس ایوانِ زیریں کے رکن بننے کے لیے پاکستان کی شہریت ہونا ضروری ہے۔

۲۔ رکن بننے کے واسطے عمر کی حد پچیس سال ہے۔

۳۔ رکن بننے کے واسطے لازمی ہے کہ وہ بطور رائے دہندہ کے اس حلقے کی ووٹر فہرست میں موجود ہو جس حلقے سے وہ انتخابات میں حصہ لینا چاہتا ہو۔ وہاں اس کا ووٹ بھی ہو لیکن تائید کنندہ اور تجویز کنندہ کا ووٹ اسی حلقے میں ہونا ضروری ہے جہاں سے الیکشن لڑنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

۴۔ کوئی حکومتی عہدہ نہ رکھتا ہو

۵۔ اس کا ذہنی توازن درست ہو۔

۶۔ کرپشن یا کسی اور بد عنوانی کی بناء پر نوکری سے برخاست نہ کیا گیا ہو۔

۷۔ اخلاقی جرم میں دو سال سے کم سزا یافتہ ہو۔

۸۔ پاکستان کی نظریات کا امین ہو، پاکستان کے اداروں مثلاً افواجِ پاکستان، عدلیہ وغیرہ کی مخالفت میں حد سے متجاوز نہ ہو۔

۹۔ ریٹائرمنٹ کے بعد دو سال کی مدت پوری کر چکا ہو۔

ووٹرز کے لیے شرائط:

۱۔ پاکستانی شہری ہو۔

---

(۱) اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، آرٹیکل ۲۲۲، ص ۱۴۱

۲۔اس کی عمر کم از کم اٹھارہ سال ہو۔

۳۔اس کا نام انتخابی فہرست میں ہو۔

۴۔دماغی طور پر مفلوج نہ ہو۔

۵۔شناختی کارڈ بنا ہوا ہو۔[۱]

قومی اسمبلی کا رکن بننے کا طریقہ کار:

آئینِ پاکستان میں اس وقت دو سو ستھر ۲۷۰ قومی اسمبلی کے حلقے ہیں جن کا براہِ راست الیکشن ہوتا ہے اور جو بھی امیدوار سب سے بڑھ کر ووٹ حاصل کرتا ہے وہی قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہو جاتا ہے۔اس کے علاوہ خواتین اقلیتوں کی بھی مخصوص نشستیں آئینِ پاکستان میں رکھی گئی ہیں۔ جو کہ متناسب نمائندگی کی بنیاد پر سیاسی جماعتوں کو دی جاتی ہیں۔[۲]

کئی نشستیں جیتنے کے باوجود ایک ہی نشست رکھے گا:

اگر کوئی امیدوار ایک سے زیادہ حلقوں میں انتخاب جیت جاتا ہے تو اسے ایک نشست کے سواء باقی تمام نشستوں سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ جن حلقوں پر دوبارہ الیکشن کروایا جاتا ہے۔ جسے ضمنی الیکشن کا نام دیا جاتا ہے۔[۳]

اسمبلی کی رکنیت کا خاتمہ:

اگر کوئی رکن مسلسل چالیس اجلاسوں میں غیر حاضر رہے تو اس کی رکنیت منسوخ ہو جائے گی۔ اگر کوئی رکن اپنی رضامندی سے اپنی رکنیت ختم کرنا چاہتا ہو تو وہ اسپیکر کو اپنا استعفیٰ دے سکتا ہے۔ آئین میں اٹھارہویں ترمیم کے بعد سیاسی جماعت کا سربراہ اپنی جماعت کے کسی بھی رکن پارلیمینٹ کو جماعت کی پالیسی کی خلاف ورزی اور فیصلوں کو تسلیم نہ کرنے پر ان کی رکنیت ختم کر سکتا ہے۔[۴]

اجلاس کی طلبی اور التواء:

وزیر اعظم کے مشورہ سے صدرِ مملکت مشترکہ یا کسی ایوان کا اجلاس طلب کر سکتا ہے اور خود ہی اسے ملتوی کر سکتا ہے۔ لیکن قومی اسمبلی کے کم از کم سال میں تین اجلاس ہونے چاہئیں جن میں کم از کم ۱۳۰ دن کا کام ہونا ضروری ہے اور دو اجلاسوں کے درمیان ۱۲۰ دن سے زیادہ کا وقفہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر اسمبلی کے ۱/۴ ارکان

---

(۱)اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، آرٹیکل ۲۲۲، ص ۱۴۱

(۲)ایضاً، آرٹیکل ۶۲، ص ۳۵

(۳)ایضاً، آرٹیکل ۲۲۳، ص ۱۴۱

(۴)ایضاً، آرٹیکل ۶۳، ص ۳۶

اجلاس بلانا چاہیں تو وہ اسپیکر سے درخواست کرسکتے ہیں۔ جس پر سپیکر پابند ہے کہ وہ ان ارکان کے بلائے گئے ایجنڈے پر قومی اسمبلی کا اجلاس بلائے۔ قومی اسمبلی کا اجلاس سپیکر ہی ملتوی کرتا ہے۔ کیونکہ اسمبلی کا اجلاس اگر سپیکر بلائے تو وہ اجلاس کا مقام اور اس کے ملتوی کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔[۱]

اسمبلی کی مدت:

آئین میں اسمبلی کی مدت پانچ سال مقرر ہے جو اس کے پہلے اجلاس سے شمار ہو گی۔[۲]

ایوانِ بالا (سینٹ)

پارلیمنٹ کا ایوانِ بالا کے رکن بننے کے اصول:

(۱) آئین کی رو سے سینٹ کے ارکان کی تعداد ۱۰۴ ہو گی۔[۳]

(الف) ہر صوبائی اسمبلی ۱۴ ارکان کا انتخاب کرے گی۔

(ب) آٹھ ارکان وفاق کے زیرِ انتظام قبائلی علاقوں سے ایسے طریقے سے منتخب کئے جائیں گے جو صدر فرمان کے ذریعے مقرر کرے۔

(ج) دو عام نشستوں پر ایک خاتون اور ایک ٹیکنو کریٹ بشمول عالم وفاقی دار الحکومت سے ایسے طریقے سے منتخب کئے جائیں گے جو صدر فرمان کے ذریعے مقرر کرے۔

(د) چار خواتین کا انتخاب ہر صوبائی اسمبلی کے ارکان کریں گے۔

(ہ) چار ٹیکنو کریٹ بشمول علماء ہر ایک صوبائی اسمبلی کے ارکان منتخب کریں گے۔

(د) چار غیر مسلم ہر ایک صوبائی اسمبلی سے ایک ایک، جنہیں صوبائی اسمبلی کے ارکان منتخب کریں گے۔

(۲) سینٹ میں ہر صوبے کے لیے متعین نشستوں کو پر کرنے کے لیے انتخاب، واحد قابلِ انتقال ووٹ کے ذریعے متناسب نمائندگی کے نظام کے مطابق کیا جائے گا۔

(۳) سینٹ تحلیل کے تابع نہیں ہو گی لیکن اس کے ارکان کی میعاد جو بحسب ذیل سبکدوش ہوں گے چھ سال ہو گی۔

(الف) شق (۱) کے پیرا (الف) میں محولہ ارکان میں سے، سات پہلے تین سال کے اختتام کے بعد سبکدوش ہو جائیں گے اور سات اگلے تین سال کے اختتام کے بعد سبکدوش ہو جائیں گے۔

---

(۱) ایضاً، آرٹیکل ۵۴، ص ۳۰

(۲) ایضاً، آرٹیکل ۵۲، ص ۲۹

(۳) ایضاً، آرٹیکل ۵۹، ص ۳۳

(ب) مذکورہ بالا شق کے پیرا(ب)میں محولہ ارکان میں سے چار پہلے تین سال کے اختتام کے بعد اور چار اگلے تین سال کے اختتام کے بعد سبکدوش ہو جائیں گے۔[1]

دستورِ پاکستان میں مقننہ کا سربراہ:

ا۔ وزیر اعظم:

شیڈول کے مطابق عام انتخابات کے بعد اکیسویں دن قومی اسمبلی کا اجلاس ہو گا، تاہم صدر اس سے پہلے اجلاس طلب کر سکتا ہے۔ جس اجلاس میں سب سے پہلے اراکین اسمبلی اپنی اسمبلی رکنیت کا حلف اٹھاتے ہیں ۔ سپیکر اور ڈپٹی اسپیکر کے انتخاب کے بعد ، قومی اسمبلی کسی اور کارروائی کے بغیر اپنے مسلمان ارکان میں سے کسی ایک کو کسی بحث کے بغیر وزیراعظم منتخب کرے گی۔ وزیراعظم قومی اسمبلی کے کل ارکان کے اکثریتی ووٹوں سے منتخب ہو گا۔اس منتخب شدہ رکن کو صدر وزیراعظم کا عہدہ سنبھالنے کی دعوت دے گا۔ وہ عہدہ سنبھالنے سے پہلے شیڈول سوّم میں درج شدہ عبارت کی صورت میں صدر مملکت کے سامنے حلف اُٹھائے گا۔ وزیراعظم کے عہدے کی میعاد کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں ہو گی۔ وزیراعظم صدر کی خوشنودی کے دوران عہدہ سنبھالے گا۔ جب صدر مطمئن ہو کہ وزیراعظم کو قومی اسمبلی کے ارکان کی اکثریت کا اعتماد حاصل نہیں رہا ہے تو وہ قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کرے گا اور وزیراعظم کو اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے لیے کہے گا۔ وزیراعظم تحریری طور پر اپنے عہدے سے استعفیٰ صدر کو ارسال کر سکتا ہے۔ صدر وزیراعظم سے اپنے عہدے پر برقرار رہنے کے لیے کہہ سکتا ہے۔جب تک کہ اس کا جانشین وزیراعظم کے عہدے پر فائز نہ ہو جائے۔[2]

۲۔ وزیر اعظم کے خلاف عدم اعتماد:

وزیراعظم کے خلاف عدم اعتماد کے ووٹ کی قرار داد جسے قومی اسمبلی کی کل رُکنیت کے کم ازکم بیس فی صد ارکان نے پیش کیا ہو، قومی اسمبلی منظور کر سکتی ہے۔ جس دن مذکورہ قرار داد قومی اسمبلی میں پیش کی گئی ہو ،اس دن سے تین دن کی مدت کے خاتمے سے پہلے یا سات دن کی مدت کے بعد ووٹ نہیں ڈالے جائیں گے۔ وزیراعظم کے خلاف عدم اعتماد کی کسی قرار داد کو قومی اسمبلی میں پیش نہیں کیا جائے گا جبکہ قومی اسمبلی سالانہ میزانیہ کے کیفیت نامے میں پیش کردہ مطالبات زر پر غور

---

(۱)اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، آرٹیکل ۶۳، ص۳۶

(۲)ایضاً، آرٹیکل ۹۴، ص۵۹

کررہی ہو۔ اگر وزیراعظم کے خلاف عدم اعتماد کی قرار داد کو قومی اسمبلی کی مجموعی رُکنیت کی اکثریت سے منظور کر لیا جائے تو وزیراعظم عہدے پر فائز نہیں رہے گا۔[1]

۳۔ کابینہ:

صدر مملکت کو اس کے کارہائے منصبی انجام دینے میں مدد اور مشورہ دینے کے لیے وزراء کی ایک کابینہ ہو گی جس کا سربراہ وزیر اعظم ہو گا۔ کابینہ بشمول وزرائے مملکت اجتماعی طور پر سینٹ اور قومی اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہو گی۔[2]

کابینہ کی تشکیل:

کابینہ تشکیل دینے کے لیے صدرِ محترم جنابِ وزیر اعظم سے مشاورت کے نتیجے میں دونوں ایوانوں کے اراکین میں سے وفاقی وزراءاور وزرائے مملکت تعین فرمائیں گے۔ لیکن اس بات کو مدِّ نظر رکھنا ضروری ہے کہ وفاقی وزراءاور وزرائے مملکت جو سینٹ سے لیے جارہے ہوں وہ کبھی بھی وفاقی وزراء کے حجم میں ایک چوتھائی سے زیادہ نہ ہوں۔ وفاقی وزراء یاوزراء مملکت اپنا عہدہ سنبھالنے سے قبل صدرِ محترم کے سامنے اپنی وزارت کا حلف لیں گے جس کی عبارت شیڈول سوم میں درج ہے۔ یہ وزراء اپنی وزرات چھوڑنا چاہیں تو اپنا استعفیٰ لکھ کر دستخط کر کے صدرِ محترم کو دیں گے۔ اور اگر ان وزراء کو ان کی وزارتوں سے برطرف کرنا ہو تو صدرِ محترم وزیرِ اعظم کے مشورے سے انہیں وزارت سے برطرف کر سکتے ہیں۔[3]

۴۔ وفاقی وزراء اور وزرائے مملکت:

صدر وزیراعظم کے مشورے پر مجلسِ شوریٰ (پارلیمنٹ) کے ارکان میں وفاقی وزراء اور وزرائے مملکت کا تقرر کرے گا؛ بشرطیکہ ان وفاقی وزراء اور وزرائے مملکت کی تعداد جو سینٹ کے رکن ہوں کسی بھی وقت وفاقی وزراء کی ایک چوتھائی تعداد سے زیادہ نہ ہو۔

صدراور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن:

پارلیمانی نظام پارلیمنٹ کو فیصلوں، قانون سازی اور جواب دہی کا مکمل طور پر اختیار دیتا ہے۔ پارلیمنٹ میں سے انتظامیہ وجود میں آتی ہے اور پارلیمنٹ کے سامنے پوری طرح جواب دہ ہوتی ہے۔ وزیراعظم کا انتخاب قومی

---

(۱) اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، آرٹیکل ۹۵، ص ۵۹

(۲)۔ ایضاً، آرٹیکل ۹۱، ص ۵۷

(۳)۔ ایضاً، آرٹیکل ۹۲، ص ۵۹

اسمبلی کرتی ہے، جو بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر براہِ راست منتخب ہوتی ہے اور وہی اسمبلی وزیر اعظم پر عدمِ اعتماد کا اظہار کر سکتی ہے۔ مملکت کا انتظام، کابینہ کے ذریعے ہوتا ہے جسے پارلیمنٹ ہی میں سے مقرر کیا جاتا ہے اور وہ 'اجتماعی جواب دہی' کے اصول پر کام کرتی ہے۔ اہم تقرریاں وزیر اعظم کے مشورے کے مطابق کی جاتی ہیں اور صدر مملکت کی حیثیت بڑی حد تک علامتی ہوتی ہے، جس کے لیے اس کا غیر جانب دار ہونا بھی ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ کاروبارِ حکومت باالعموم صدر کے نام پر ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ ریاست کی علامت اور وفاق کی شناخت تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن عملاً حکومت کی ذمہ داری کابینہ انجام دیتی ہے، جو وزیر اعظم، وزراء اور وزرائے مملکت پر مشتمل ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ پارلیمانی نظام میں یہ خطرہ رہتا ہے کہ وہ کہیں وزیر اعظمی نظام نہ بن جائے۔ اس کے لیے وزیر اعظم کو بھی اداراتی مشاورت کے نظام کا پابند کیا جاتا ہے اور 'صوابدیدی اختیارات' کو جس حد تک ممکن ہو محدود کیا جاتا ہے۔ فیصلہ سازی اور تقرریوں کے عمل کو زیادہ سے زیادہ شفاف اور اہلیت کے مطابق بنایا جاتا ہے، تاکہ اختیارات میں ارتکاز نہ ہو اور افراد اور اداروں کے درمیان توازن قائم رہ سکے۔[1]

یہ ضروری تھا ان مقاصد کو پانے کے لیے کہ صدر نے جو اختیارات آٹھویں اور سترہویں ترامیم کے ذریعے حاصل کر لیے ہیں، ان کو بطریق احسن وزیر اعظم، کابینہ اور پارلیمنٹ کی طرف منتقل کیا جائے، اور ان سے وابستہ تصورات کو غیر مبہم بنانے کے لیے الفاظ بھی وہ استعمال کیے جائیں جو اختیارات میں توازن کو حقیقی بنا سکیں۔

اس مقصد کے حصول کے لیے اٹھارہویں ترمیم میں حسب ذیل تبدیلیاں ہوئی ہیں:

۱۔ نمایاں ترین چیز دستور کی دفعہ ۵۸ (۲) ب کی تنسیخ ہے، جس کے ذریعے صدر کو مرکز میں اور صوبوں میں اس کے نمائندہ گورنر کو اسمبلیاں توڑنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ بلاشبہ آٹھویں ترمیم میں صدر کے اس اقدام کو عدالت میں قابلِ مواخذہ بنایا گیا تھا، اور سترہویں ترمیم میں ایسے اقدام کو خود بخود سپریم کورٹ کے 'جائزے' (ریویو) کا پابند کر دیا گیا تھا۔ مگر اصل چیز صدر کا وہ صوابدیدی اختیار تھا جو اسمبلیوں پر تلوار کی طرح لٹک رہا تھا۔ اب یہ اختیار بلکل ختم ہو چکا ہے ۔

۲۔ صدر کو اپنے صوابدیدی اختیار سے مسلح افواجِ پاکستان کے تینوں سربراہوں اور جوائنٹ چیف آف سٹاف کے تقرر کا اختیار تھا۔ وہ اَب وزیر اعظم کو منتقل ہو گیا ہے۔ اسی طرح چیف الیکشن کمشنر اور کمیشن کے ارکان، اور عبوری حکومت کے سربراہ کے تقرر کا اختیار بھی صدر کو حاصل ہو گیا تھا۔ لیکن اب اٹھارہویں ترمیم کے تحت یہ تقرریاں وزیر اعظم کے ہاتھوں ایک پارلیمانی انتظام کی مشاورت سے واقع ہوں گی۔ گورنروں کے تقرر میں بھی اب

---

(۱)۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، آرٹیکل ۹۷، ص ۶۰

وزیر اعظم کا مشورہ فیصلہ کن ہو گا۔ اسی طرح ججوں کے تقرر کا بھی نیا نظام تجویز کیا گیا ہے۔ پبلک سروس کمیشن کا سربراہ بھی اب وزیر اعظم کے مشورے پر مقرر کیا جائے گا۔

۳۔ آٹھویں ترمیم کے ذریعے وزیر اعظم کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ صدرِ مملکت کو کابینہ کے تمام فیصلوں اور قانون سازی کی تجاویز اور جملہ انتظامی امور سے مطلع رکھے، اور یہ اختیار صدر کو بھی حاصل تھا کہ وہ کابینہ سے اس کے کوئی بھی فیصلے یا کوئی اور دوسرے امر کے بارے میں از سرِ نو غور کا مطالبہ کر سکتا تھا۔ ان تمام حصوں کو اب حذف کر دیا گیا ہے، اور اس کے لیے ایک جامع دفعہ رکھی گئی ہے، جس کے تحت وزیر اعظم تمام ملکی اور بیرونی امور پر صدر کو عمومی طور پر مطلع رکھے گا۔ مگر محض صدر کی ایماء پر کوئی مسئلہ زیر غور نہیں آئے گا۔

۴۔ ایک اہم تبدیلی یہ کی گئی ہے کہ دفعہ ۹۹ میں انتظامِ حکومت، صدر کے بجائے مرکزی حکومت کی ذمہ داری ہو گی۔ ایسی ہی تبدیلی گورنر اور صوبائی حکومت کے ذیل میں بھی کی گئی ہے۔ نیز حکومت کی جانب سے 'حکومتی قواعد کار' (rules of business) مرتب کرنے اور ان میں تبدیلی لانے کی ذمہ داری بھی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو حاصل ہو گئی ہے، جن کے سربراہ وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ ہوں گے۔ صدر یا گورنر کا دخل اس باب میں بھی ختم کر دیا گیا ہے۔[1]

پارلیمان کی بالادستی کے لیے نیا نظام:

پارلیمنٹ کی بالادستی کے قیام اور اہم تقرریوں کو خود وزیر اعظم کے صوابدیدی اختیار کے دائرے سے نکال کر اداراتی مشاورت کے ذریعے انجام دینے والے نظام کا اختیار کیا جانا، جو نیا نظامِ کار اختیار کیا گیا ہے اس کے لیے اٹھارہویں ترمیم کے مطابق یہ خاص تبدیلی ہے۔ جو نیا نظامِ کار ہے، وہ پارلیمنٹ کو زیادہ کارفرما قوت بنانے اور وزیر اعظم کے اختیارات کو محدود کرنے کا باعث ہو گا:

۱۔ سب سے اہم تبدیلی الیکشن کمیشن کے تصور اور اس کے تقرر کے طریق کار میں ہے، جس کے نتیجے میں الیکشن کا نظام زیادہ غیر جانب دار اور شفاف ہو سکے گا، جو جمہوریت کی روح ہے۔ اس سلسلے میں پہلی تبدیلی یہ ہے اب الیکشن کمیشن ایک مستقل ادارہ ہو گا اور اس میں مرکزی کردار صرف الیکشن کمشنر کا نہیں بلکہ پورے کمیشن کا ہو گا، جو چیف الیکشن کمشنر اور چار ججوں پر مشتمل ہو گا، اور وہ چاروں صوبوں سے لیے جائیں گے۔ ان کا تقرر وزیر اعظم اور قائد حزب اختلاف باہمی مشورے سے کریں گے اور وہ تین نام ایک پارلیمانی کمیٹی کو دیں گے، جو ۱۲ افراد پر مشتمل

---

(۱)۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، آرٹیکل ۹۹، ص ۶۰

ہو گی، جس میں ایک تہائی ارکانِ سینٹ ہوں گے اور یہ کمیٹی تجویز کردہ ناموں میں سے ایک کا انتخاب کرے گی۔ اسی طرح کمیشن کا تقرر پانچ سال کے لیے ہو گا اور اس میں توسیع نہیں ہو سکے گی۔ (۱)

۲۔ پبلک سروس کمیشن کے سربراہ کا تقرر بھی وزیر اعظم، قائد حزب اختلاف کے مشورے سے کرے گا۔ یوں الیکشن کے نظام کو شفاف اور قابلِ اعتماد بنانے اور سروسز کے انتخاب کے عمل کو حکومتِ وقت کی گرفت سے نکالنے اور معیار و قابلیت کے نظام کو ترویج دی گئی ہے۔ (۲)

۳۔ اسی طرح ججوں کے تقرر کے نظام کو ہر سطح کے 'صوابدیدی اختیار' سے پاک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سب سے سینئیر جج کے چیف جسٹس بننے کے اصول کو تسلیم کیے جانے اور اس اہم ترین تقرری میں انتظامیہ کی مداخلت کو ختم کر دیا گیا ہے۔ نئے ججوں کے تقرر کے لیے برتری عدالت کو حاصل ہے، جس میں عدالتی کمیشن کا سربراہ چیف جسٹس آف پاکستان ہو گا۔ اس میں سپریم کورٹ کے دو سب سے سینئیر جج اور سپریم کورٹ کا ایک ریٹائرڈ چیف جسٹس یا جج ہو گا، جسے چیف جسٹس آف پاکستان باقی دو ججوں کے مشورے سے مقرر کریں گے۔ باقی تین افراد وزیر قانون، اٹارنی جنرل اور سپریم کورٹ کا ایک سینئیر ایڈووکیٹ جسے پاکستان بار کونسل نامزد کرے گی۔ اس طرح سات میں سے چار جج ہوں گے۔ یہ عدالتی کمیشن نئے ججوں کے لیے جو نام تجویز کریں گے، وزیر اعظم اپنے صوابدیدی اختیار سے تقرر کے لیے صدر کو نہیں بھیجیں گے، بلکہ ایک پارلیمانی کمیٹی کو بھیجیں گے، جس میں چار ارکان حکومتی پارٹی سے اور چار حزبِ اختلاف سے ہوں گے۔ نیز اُن میں سے چار قومی اسمبلی اور چار سینٹ کے ارکان ہوں گے، جنھیں ۱۴ دن کے اندر اندر تجویز کردہ نام کی توثیق کرنا ہو گی اور صرف تین چوتھائی اکثریت سے انھیں نام رد کرنے کا اختیار ہو گا۔ گویا کہ اس طرح ہر سطح پر صوابدیدی اختیار کو ختم کر کے اداراتی مشاورت کا نظام قائم کیا جا رہا ہے اور نئے ججوں کے ناموں کا اوّلین انتخاب عدلیہ کے توسط سے ہو گا۔ (۳)

کوئی وزیر جو مسلسل چھ ماہ تک قومی اسمبلی کا رکن نہ رہے، مذکورہ مدت کے اختتام پر وزیر نہیں رہے گا اور اس اسمبلی کی تحلیل سے قبل اسے دوبارہ وزیر مقرر نہیں کیا جائے گا تاوقتیکہ وہ اسمبلی کا رکن منتخب نہ ہو جائے۔ تاہم سینٹ کے رکن پر اس شرط کا اطلاق نہیں ہو گا اور اس شرط کی وجہ سے وزیر اعظم یا وفاقی وزیر یا وزیر مملکت کو کسی ایسی مدت کے دوران، جب کہ قومی اسمبلی تحلیل ہو گئی ہو،

---

(۱)۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، آرٹیکل ۲۱۳، ص ۱۳۷

(۲)۔ ایضاً، آرٹیکل ۲۴۲، ص ۱۵۹

(۳)۔ ایضاً، آرٹیکل ۱۷۷، ص ۱۰۵

اپنے عہدے پر برقرار رہنے کے لیے نا اہل قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی اس شرط کی وجہ سے کسی ایسی مدت کے دوران کسی شخص کو بطور وزیر اعظم یا وفاقی وزیر یا وزیر مملکت مقرر کرنے کی ممانعت ہو گی۔

صوبائی خود مختاری:

اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے ایک انقلابی اقدام 'مشترک لسٹ' کا خاتمہ اور مرکز اور صوبوں کے درمیان تعلقاتِ کار کی نئی بساط بچھانا، ایک مستحسن قدم ہے جس کے نتیجے میں اختیارات اور وسائل، صوبوں کی طرف منتقل ہوں گے۔ قانون سازی کی مرکزی فہرست کے حصہ دوم کو وسعت دی گئی ہے اور مشترکہ مفادات کی کونسل (CCI) کو ایک مؤثر اور کارفرما ادارہ بنا کر حکمرانی اور فیصلہ سازی میں مرکز اور صوبوں کے اشتراک کا ایک نیا نظام تجویز کیا گیا ہے۔ قومی اقتصادی کونسل (NEC) کو بھی مؤثر اور متحرک بنایا گیا ہے۔ 'قومی مالیاتی ایوارڈ' کو صوبوں کو وسائل کی فراہمی کے لیے ایک نیا آہنگ دیا گیا ہے۔ ملک کے وسائل پر مرکز اور صوبوں میں ملکیت اور انتظام و انصرام کے اشتراک کا بندوبست تجویز کیا گیا ہے۔ پن بجلی کے منصوبوں کے سلسلے میں متعلقہ صوبے سے مشاورت لازم کی گئی ہے اور مرکز اور صوبوں میں تعلقاتِ کار کے نظام کو بالکل ایک نئی جہت دی گئی ہے۔

اگر ان تجاویز پر ایمان داری سے عمل ہوتا ہے اور مرکز اور صوبے اپنے اپنے کام ذمہ داری سے انجام دیتے ہیں، تو اگلے چند برسوں میں ملک کی قسمت بالکل بدل سکتی ہے۔ وسائل کا بہاؤ مرکز سے صوبوں کی طرف مڑ سکتا ہے۔ بالکل نچلی سطح پر معاشی اور سیاسی گرمیوں میں غیر معمولی اضافہ واقع ہو سکتا ہے، جو محرومیوں کو دُور کرنے کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح صوبوں کی نمایندگی، مرکز ہی نہیں تمام مرکزی اداروں میں یقینی بنانے اور ماضی کی زیادتیوں کا ازالہ کرنے کا انتظام بھی دستوری ترامیم میں تجویز کیا گیا ہے۔[1]

صوبائی خود مختاری کا نیا مثالیہ جو ان دستوری سفارشات میں دیا گیا ہے، اپنی اصل کے اعتبار سے ۱۹۷۳ء کے بعد ایک انقلابی آئینی اقدام ہے۔ خدا کرے کہ اس پر صحیح خطوط پر عمل ہو سکے۔ نتائج کا اصل انحصار عمل پر ہے اور ان ترامیم کے بعد اب مرکز اور صوبوں، بلکہ سب کا بڑا امتحان ہے۔

اسلامی دفعات:

اٹھارہویں ترمیم میں اہم شق دستور میں موجود اسلامی دفعات کے بارے میں یہ ہے کہ ۱۹۷۳ء و ۱۹۸۵ء کی دفعات کو اس نے باہم یک جان کر دیا ہے، اور اس طرح دستور کی اسلامی دفعات زیادہ مؤثر ہو گئی ہیں۔ سیکولر قوتوں کو اس سلسلے میں جو پسپائی ہوئی ہے، وہ اسلامیانِ پاکستان کی ایک بڑی کامیابی ہے، لیکن اٹھارہویں ترمیم کے

---

(۱) اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، آرٹیکل ۱۳۷، ص ۷۹

ذریعے صرف ان دفعات کو مستحکم ہی نہیں کیا گیا ہے، بلکہ کئی چیزیں ایسی ہیں جو شدید مزاحمت کے باوجود حاصل کی گئی ہیں، مثلاً:

۱۔ وزیر اعظم کے لیے مسلمان ہونا دستور کے متن میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے صرف وزیر اعظم کے حلف میں اس کا ذکر تھا، جو ایک بالواسطہ کیفیت تھی۔ (۱)

۲۔ سب سے اہم چیز وفاقی شرعی عدالت کی حیثیت، اس کے ججوں کی آزادی اور ان کو توہین آمیز حد تک جس بے وقعتی کا نشانہ بنایا گیا تھا اسے ختم کرنا ہے۔ حکومت جس جج کو چاہے اس عدالت میں اُس کی مرضی کے خلاف بھیج سکتی تھی۔ اس عدالت میں اگر حکومت کسی جج سے ناخوش ہے تو جس وقت چاہے اس کو تبدیل کر سکتی تھی، فارغ کر سکتی تھی، کوئی دوسرا کام اس کو سونپ سکتی تھی۔ ان کو ملازمت کا کوئی تحفظ حاصل نہیں تھا اور یہ سب کچھ عملاً بھی ماضی میں کیا گیا۔ جس جج حتیٰ کہ چیف جسٹس نے بھی اگر حکومت کے اشاروں کو نظر انداز کیا تو اسے یک بینی و دو گوش فارغ کر دیا گیا۔ اب شرعی عدالت کے جج بھی عدالت عالیہ کے ججوں کے مساوی ہوں گے۔ ان کا حلف بھی وہی ہو گا۔ ان کے تقرر، تبادلے اور برطرفی کے لیے وہی قانون لاگو ہو گا۔ پہلی مرتبہ وفاقی شرعی عدالت ایک حقیقی، آزاد اور بااختیار عدالت بن سکے گی۔ (۲)

۳۔ اس کے ساتھ وفاقی شرعی عدالت میں علمائے کرام سے بطور جج تقرر کے لیے جو مطلوبہ دینی اور علمی صلاحیت درکار تھی، اسے بھی بہتر بنایا گیا ہے۔ پہلے کسی بھی شخص کو جسے اسلامی علوم کا ماہر قرار دیا جائے جج مقرر کیا جا سکتا تھا۔ اب اس کے لیے وہی استعداد اور صلاحیت مقرر کر دی گئی ہے جو دستور میں 'اسلامی نظریاتی کونسل' (IIC) کے علماء ارکان کے لیے ہے۔ یعنی ۱۵ سال کا تجربہ، اسلامی قانون کی تعلیم، تحقیق یا افتاء کا تجربہ۔ (۳)

۴۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے سلسلے میں بھی ایک ترمیم یہ کی گئی ہے کہ کونسل میں علماء ارکان کی تعداد کل تعداد کا کم از کم ایک تہائی (۱/۳) ضروری ہے۔ پہلے ان کی زیادہ سے زیادہ تعداد چار تھی، جو اس وقت تو مناسب تھی جب کونسل کے کُل ارکان آٹھ ہوتے تھے، مگر اب جب کہ وہ ۲۰ ہیں، ان میں چار کی تعداد بہت کم تھی۔ اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے علماء کی کم سے کم تعداد ایک تہائی مقرر کی گئی ہے۔ اسی طرح علماء اور مختلف مکاتبِ فکر کی بہتر نمائندگی کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔

---

(۱)۔ ایضاً، آرٹیکل ۲۲۷، ص ۱۴۵

(۲) اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، آرٹیکل ۲۰۳، ص ۱۲۱

(۳) ایضاً

۵۔ دستور کی دفعہ ۶۲ اور ۶۳ سیکولر لابی کا خاص ہدف تھے۔ لیکن نہ صرف یہ کہ ان میں اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی تبدیلی یا تخفیف نہیں کی جاسکی بلکہ دفعہ ۶۳ ۔ایف میں جس کو بہت نشانہ بنایا گیا ایسی ترمیم کی گئی ہے جس سے اس کے غلط استعمال کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ ایک شخص کی امانت، دیانت اور اچھی شہرت کے سلسلے میں نااہلی کو عدالتی فیصلے سے وابستہ کر دی گئی ہے۔

آرڈیننس سے قانون سازی کی حوصلہ شکنی:

پارلیمنٹ کا اصل کام قانون سازی ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں قانون سازی کے لیے بے جا آرڈیننس جاری کرنے کا آسان راستہ اختیار کیا گیا، جس کی وجہ سے پارلیمنٹ ایک قسم کی ربڑ اسٹیمپ بن کر رہ گئی ہے۔ دنیا کے بیش تر جمہوری ممالک میں انتظامیہ کو آرڈیننس کے ذریعے قانون سازی کا اختیار حاصل نہیں۔ امریکا اور یورپ میں تو اس کی ایک بھی مثال نہیں ملتی۔ برعظیم پاک وہند میں برطانیہ نے اپنے دورِ اقتدار میں آرڈیننس کے ذریعے حکمرانی کا راستہ اختیار کیا۔ نتیجتاً جب اُن کے جانشین یہاں پر حکمران بنے تو انھوں نے بھی پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش میں قانون سازی کی یہ قبیح صورت جاری رکھی۔ تاہم ایک فرق ضرور ہے کہ بھارت میں ۱۰۰ میں سے بمشکل ۱۰ قوانین، آرڈیننس کے ذریعے اور ۹۰ معمول کی قانون سازی کے ذریعے کتابِ قانون کا حصہ بنتے ہیں، جب کہ پاکستان میں یہ تناسب بالکل اُلٹ ہے، یعنی ۸۰ فی صد سے زیادہ قوانین آرڈیننس کے ذریعے مسلط کیے جاتے ہیں اور ایک ہی آرڈیننس کو بلاترمیم یا کچھ نمائشی تبدیلی کے بعد بار بار نافذ کیا جاتا رہتا ہے۔ بڑے مفصل قوانین کو نافذ کرنے کے لیے اسمبلی کے اجلاس کی برخاستگی کا انتظار کیا جاتا ہے۔ پھر اسمبلی کے اجلاس کے ختم ہونے کے ۲۴ گھنٹے کے اندر ہی آرڈیننسز کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ سیاسی جماعتیں جب حزب اختلاف کا کردار ادا کرتی ہیں تو قانون سازی بذریعہ آرڈیننس کی مخالفت کرتی ہیں اور جب اقتدار میں آتی ہیں تو بڑی ڈھٹائی اور سخت بے رحمی کے ساتھ اس مکروہ طریقے کو روا رکھتی ہیں۔ بعض ممبران نے پوری دل سوزی کے ساتھ دستوری کمیٹی میں آرڈیننس کے اس طرح مسلط کرنے کا دروازہ بند کرنے کی تجویز پیش کی، لیکن بڑی مشکل سے جو کچھ حاصل کیا جاسکا، وہ درج ذیل ہے۔

۱۔ پہلے جب سینٹ برسرِکار (in session) ہو، اس وقت بھی آرڈیننس نافذ کیا جاسکتا تھا۔ صرف اسمبلی کے سیشن کے دوران یہ پابندی تھی کہ آرڈیننس نہیں لاگو کیا جاسکتا (دفعہ ۸۹)۔ اب فرق یہ پڑا ہے کہ اگر سینٹ بھی سیشن میں ہو تو آرڈیننس نہیں آسکے گا۔[1]

۲۔ ایک ہی آرڈیننس کو بار بار نافذ کرنا پارلیمنٹ کے ساتھ مذاق ہی نہیں، اس کی توہین بھی ہے۔ عدالتِ عظمیٰ نے بھی اس کے متعلق کئی بار اپنے تحفظات کا اقرار کیا، مگر لاحاصل۔ اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے کم سے کم

---

(۱)۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، آرٹیکل ۸۹، ص ۵۴

پابندی لگ گئی ہے کہ حکومت ایک ہی آرڈیننس کو دوبارہ اپنی مرضی سے جاری نہیں کر سکتی۔ اگر اس کی مدت میں توسیع ناگزیر ہے تو اس کے لیے پارلیمنٹ کے کم از کم ایک ایوان کی قرارداد لازم قرار دی گئی ہے، اور پارلیمنٹ کو بھی پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ ایک سے زیادہ مرتبہ توسیع نہیں دے سکتی۔ (۱)

توقع ہے کہ اس کے بعد پارلیمنٹ کے ذریعے قانون سازی کے عمل میں اضافہ ہو گا اور آرڈیننس کے ذریعے قانون سازی میں کمی واقع ہو گی۔

سینٹ کے اختیارات میں اضافہ:

پارلیمنٹ کا ایوانِ بالا (سینٹ) فیڈریشن کا مظہر اور صوبوں سے برابری کی بنیاد پر نمائندگی کی وجہ سے ان کے حقوق کے محافظت میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے سینٹ کو قومی اسمبلی کے مساوی حیثیت تو نہیں دی جا سکی، لیکن نصف درجن سے زیادہ ترامیم کے ذریعے اس کے اختیارات اور کردار میں خاطر خواہ اضافہ ضرور کیا گیا ہے۔ اب سینٹ سال میں ۹۰ دن کے بجائے ۱۱۰ دن لازمی سیشن میں رہے گا۔ متعدد سرکاری اور پارلیمانی رپورٹوں کے متعلق بھی یہ لازمی کر دیا گیا ہے کہ ان کو قومی اسمبلی کے ساتھ سینٹ میں بھی پیش کیا جائے، تاکہ سینٹ ان پر اپنی رائے دے سکے۔

جیسا کہ اُوپر عرض کیا گیا ہے، سینٹ جب سیشن میں ہو تو اس وقت بھی آرڈیننس کے اجراء پر پابندی لگادی گئی ہے۔ اہم حکومتی پارلیمانی کمیٹیوں میں سینٹ کو نمائندگی دی گئی ہے، یعنی ججوں کے تقرر کی کمیٹی اور الیکشن کمیشن کمیٹی کے ارکان کی نامزدگی کی ذمہ دار کمیٹی وغیرہ میں۔ اسی طرح بجٹ، فنانس بل اور منی بل کے لیے بھی اب سینٹ میں غور و بحث اور اپنی تجاویز دینے کے لیے سات کے مقابلے میں ۱۴ دن مقرر کیے گئے ہیں۔ قومی اسمبلی کے لیے ضروری کر دیا گیا ہے کہ وہ سینٹ سے آئی ہوئی سفارشات پر غور کرے گی، گو اس پر پابندی لازم نہیں ہے۔ (۲)

اپنے جوہر کے اعتبار سے ایک بڑی اہم ترمیم یہ کی گئی ہے کہ اب مرکزی کابینہ اور وزیر اعظم، قومی اسمبلی کی طرح سینٹ کے سامنے بھی جواب دہ ہوں گے۔ گو وزیر اعظم کے انتخاب کا فریضہ صرف قومی اسمبلی ہی ادا کرے گی، لیکن حکومت کی جواب دہی کو اب پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں تک وسعت دے دی گئی ہے۔ اس سلسلے کی تمام ترامیم کے نتیجے میں توقع ہے کہ سینٹ کا کردار بڑھے گا، قانون سازی کا عمل بہتر ہو سکے گا اور صوبوں کی آواز کو زیادہ وقعت اور اہمیت حاصل ہو سکے گی۔ صوبائی خود مختاری کے نئے ماڈل پر عمل درآمد کے لیے سینٹ کا کردار بہت کلیدی

---

(۱) ایضا

(۲)۔ ایضاً، آرٹیکل ۵۹ ، ص ۳۳

اہمیت کا حامل ہے اور ان سب ترامیم کا حاصل فیڈریشن کے باہم اور متوازن تعلقاتِ کار کے تصور کو ایک قابلِ عمل صورت دینا ہے۔

اسمبلی سے رکنیت کے خاتمے کا اختیار:

ایک مسئلہ سیاسی جماعت کے سربراہ کے اس اختیار سے متعلق ہے کہ وہ پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی کی شکل میں ایک رکن اسمبلی کو سیٹ سے محروم کرنے کی سفارش سینٹ کے چیئرمین یا اسمبلی کے اسپیکر کو کر سکتا ہے، اور ایسی صورت میں ایک متعین مدت کے اندر چیئرمین سینٹ یا اسپیکر اسمبلی کو اسے الیکشن کمیشن کو بھیجنا ہو گا۔

ہمارے خیال میں اس شق پر تنقید پوری ذمہ داری سے نہیں کی جارہی۔ جس طرح سیاسی جماعتوں میں قیادت کا انتخاب اور جمہوری روایات کا احترام ضروری ہے اسی طرح پارٹی میں ڈسپلن بھی ایک ضروری امر ہے۔ دستور میں دفعہ ۶۳ (اے) کا اضافہ، پارٹی سے 'بغاوت' یا 'بے وفائی' کو قانون کی گرفت میں لانے کے لیے کیا گیا تھا۔ اس میں جو ترامیم اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے کی گئی ہیں، وہ صرف دو ہیں: ایک یہ کہ پارٹی کے پارلیمانی لیڈر کی جگہ پارٹی کے سربراہ کو یہ اختیار دیا ہے اس کے متعلق دو آراء ہو سکتی ہیں، لیکن پارٹی ڈسپلن کے نقطۂ نظر سے پارٹی کے سربراہ کو اس کا اختیار دینا کسی اعتبار سے بھی جمہوری اصولوں سے متصادم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ واضح رہے کہ اس دفعہ میں یہ بات بھی وضاحت سے لکھی گئی ہے کہ:

بشرطیکہ اعلان کرنے سے پہلے پارٹی کا سربراہ ایسے ممبر کو موقع فراہم کرے گا کہ وہ وجہ بتائے کہ اس کے خلاف ایسا اعلان کیوں نہ کیا جائے۔

اس طرح یہ اعلان دفاع کا حق دیئے جانے سے مشروط ہے۔ لیکن دوسری شرط اور بھی اہم ہے کہ یہ اقدام محض اختلاف رائے یا عام معاملات حتیٰ کہ قانون سازی کے معاملات میں اختلاف کی بنیاد پر نہیں ہو سکتا۔ اس اقدام کا جواز صرف اس وقت ہے جب ایک رکن پارٹی کے فیصلے کے خلاف صرف چار امور پر ووٹ دیتا ہے یا پارٹی کی ہدایت کے باوجود ووٹ دینے سے احتراز کرتا ہے اور وہ یہ ہیں:

- وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ کا انتخاب - حکومت پر اعتماد یا عدمِ اعتماد کا ووٹ - منی بل کے بارے میں ووٹ - دستوری ترمیم پر ووٹ۔

انتظامیہ:

انتظامیہ کی دو قسمیں ہوتی ہیں

۱۔ سیاسی انتظامیہ

۲۔ غیر سیاسی انتظامیہ

۱۔ سیاسی انتظامیہ سے مراد حکومت کے وہ افراد ہیں جو انتخابات کے ذریعے بر سرِ اقتدار آتے ہیں، وہ باقاعدہ ملازم نہیں ہوتے۔ بلکہ انتخابات کے ذریعے بر سرِ اقتدار آتے ہیں اور مقررہ مدت تک فرائض سرانجام دیتے ہیں جیسے وزیر اعظم اور وزراء کی کابینہ وغیرہ۔ جسے قومی اسمبلی کے عنوان میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان سب کو سیاسی انتظامیہ کہتے ہیں۔

۲۔ غیر سیاسی انتظامیہ سے مراد جو سرکاری ملازمین پر مشتمل ہوتی ہے۔ جیسے وزارتوں کے سیکرٹری ہر محکمے میں بطور سربراہ کے کام کرتے ہیں۔ سیکرٹری بائیسویں گریڈ کا اعلیٰ افسر ہوتا ہے ان کو عرفِ عام میں بیوروکریٹس کہا جاتا ہے۔ یہ تنخواہ دار ہوتے ہیں ان کا تعلق بظاہر کسی حکومت یا انتخابات سے نہیں ہوتا بلکہ جو بھی حکومت آئے یہ اپنے فرائض انجام دیتے رہتے ہیں۔ دستورِ پاکستان میں دونوں قسم کی انتظامیہ کے بارے میں قواعد وضوابط درج ہیں اور ان کے حدود اور اختیارات کا تعین درج ہے۔ حکومت کیسے بنے گی اور سرکاری ملازمین کس طرح اور کن شرائط پر بھرتی کیے جائیں گے۔ عام طور پر سرکاری ملازمین کو یہ آئینی تحفظ حاصل ہوتا ہے کہ ان کو کسی معقول وجہ کے بغیر ملازمت سے الگ نہیں کیا جاسکتا، اس لیے سیاسی حکومتیں آتی جاتی رہتی ہیں مگر یہ ملازمین اپنی جگہ بر قرار رہتے ہیں آنے والی حکومتیں اپنے منظور نظر افسران اور ملازمین کو من پسند جگہ پر تعینات کرتی ہیں۔ حکومت حکمت عملی کے تحت ان ملازمین کا اکھاڑ پچھاڑ کرتی ہے کیونکہ حکومت کو اندیشہ ہوتا ہے کہ بعض ملازمین کی گرفت اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ وہ حکومتی فیصلوں پر اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ اس لیے ایسی صورتوں میں ان کے اثر و نفوذ کو ختم کرنے کے لیے ان کو ان کی جگہوں سے ہٹا کر دوسری جگہوں میں تبادلہ کر دیا جاتا ہے۔ افسروں کے اس اثر و نفوذ کو افسر شاہی یا نوکر شاہی کہتے ہیں عرف عام میں ان افسروں کو بیوروکریٹ اور ان کی افسر شاہی کو بیوروکریسی کا نام دیا جاتا ہے۔

غیر سیاسی انتظامیہ میں سربراہان کے تقرر کے اصول

اس کے لیے مرکزی سپیئر سروسز (سی ایس ایس یا بیوروکریسی) ایک مستقل اشارہ دار بیوروکریٹک اتھارٹی ہے۔[1]

جو سول سروس شہری بیوروکریٹک آپریشن، حکومتی سیکرٹریٹ اور پاکستان کی کابینہ کے ڈائریکٹروں کو چلانے کا ذمہ دار ادارہ ہے۔ آئین پاکستان کی رو سے غیر سیاسی انتظامیہ کے سربراہ کا تقرر اور حتمی اختیار وزیرِ اعظم کا ہوتا ہے۔ سول سروس خود کو اہم پہیوں کے طور پر متعین کرتی ہے جس پر ریاست کے پورے انجن کو منتقل کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان سول سروس نے ریاست کے دفاع، اندرونی، بیرونی یعنی غیر ملکی اور مالی پالیسیوں کو ابتداءً مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بعد میں ان پالیسیوں کو ۱۹۷۳ء میں آئین کے آرٹیکل ۲۴۰ کے تحت از سرِ نو منظم اور بحال کیا

---

(۱) سول سروس آف پاکستان، ۵ ستمبر ۲۰۱۲

گیا۔ جس نے اسے بنیاد اور آئینی حیثیت دی۔ قومی سکیورٹی کے بارے میں معاملات میں سول بیوروکریسی سے ملحقہ پاکستانی مسلح افواج کے فوجی اداروں کے ساتھ مل کر تعاون کیا۔[1]

بیوروکریسی پر مشتمل ۱۲ ڈائریکٹرز ہیں جو پاکستان کے لیے اہم دفاتر اور سیکٹریٹ کے متعلق فرائض فراہم کرتے ہیں۔ صوبائی محکمہ جات، صوبہ خیبر پختون خواہ، صوبہ سندھ، صوبہ پنجاب، اور صوبہ بلوچستان کے متعلقہ چیف سیکرٹریز کی قیادت میں ہیں۔ ملک کی بیوروکریسی میں کام کرنے والے ایک افسر کے لیے سب سے زیادہ یعنی آخری / قابل درجہ بی پی ایس ۲۲ گریڈ ہے۔ سب سے زیادہ بااختیار سول ملازمین پاکستان ایڈمنسٹریٹو سروس اور اعلیٰ درجے کی سول سروس کی حیثیت سے وفاقی سیکرٹریوں اور صوبائی سربراہ سیکرٹری ہیں۔ پاکستان سول سروسز میرٹ، تعلیم، اہلیت اور تجربے کے ذریعے درخواست دہندگان میں سے صرف ساڑھے سات فیصد کا انتخاب کرتی ہے۔ جبکہ ساڑھے بانوے فیصد کو کوٹہ سسٹم کے ذریعے منتخب کیا جاتا ہے۔ سول سروس کے امتحانات مسابقتی ہوتے ہیں جنہیں مقابلے کے امتحانات کہا جاتا ہے۔ جو کہ امیدواروں کی اہلیت پر منحصر ہوتے ہیں۔ جس میں مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں مواقع ہوتے ہیں۔ سی ایس ایس امتحانات ہر سال کے آغاز میں منعقد ہوتے ہیں امتحان وفاقی پبلک سروس کمیشن کی طرف سے منظم کئے جاتے ہیں اور انہیں کی نگرانی میں کروائے جاتے ہیں۔[2]

---

(۱) سول سروس آف پاکستان، ۵ ستمبر ۲۰۱۲

(۲) ایضاً، ۵ ستمبر ۲۰۱۲

فصل سوم:

اداروں پر سربراہان کے اثرات اہلیت اور نااہلیت کے تناظر میں

اداروں پر سربراہان کے اثرات اہلیت اور نااہلیت کے تناظر میں:

پوری دنیا میں اہلیت کی بنیاد پر اداروں کے سربراہ لگائے جاتے ہیں اقرباء پروری یا مفادات کی بنیاد پر نا اہل لوگوں کو مناصب حوالے کرنے سے پہلے اس ادارے کی اور پھر ملک کی تباہی پر معاملہ ختم ہوتا ہے۔ جس کی دو مثالیں ذیل میں درج ہیں۔

ا۔ بنو امیہ کی حکومت کے زوال کے اسباب

۲۔ سقوطِ ڈھاکہ کے اسباب حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ کے تناظر میں

پہلے بنو امیہ کی حکومت کے خاتمے اور زوال کے اسباب پر بات کرتے ہیں۔

ا۔ بنو امیہ کی حکومت کے زوال کے اسباب:

بنو امیہ کی حکومت ایک شخصی حکومت تھی۔ شخصی حکومتیں اپنے قیام اور استحکام میں حکمران طبقے کی اہلیت اور قابلیت کی مرہون منت ہوتی ہیں ۔ ۔ چنانچہ جس وقت تک بنو امیہ کی قیادت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، عبد الملک، ولیدِ اول اور ہشام کی طرح کے قابل حکمرانوں کے پاس تھی تو دنیا میں ان کی حکومت کا ڈنکا بجتا رہا۔ مشرق سے مغرب تک کوئی قوم یا حاکم مقابلہ نہ کر سکا ان کی یلغار کا۔ سپین، افریقہ، عراق، سندھ، ترکستان، جزائر، بحیرہ روم اور شام وغیرہ یہ سب ان کے قبضے میں تھے۔ انہوں نے تہذیب و تمدن کی نئی بنیادیں رکھیں۔ حکومت، سماجی، معاشرتی زندگی اور نظم و نسق میں بہت سی اہم اصلاحات نافذ کیں اور ملکی قومی خوشحالی کو دگنا کیا لیکن جب مسند خلافت پر ایسے لوگ فائز ہوئے جو دلیری، شجاعت، تدبیر، عزم اور رائے سے عاجز تھے۔ تو بنو امیہ کی خلافت تباہ ہونا شروع ہو گئی جو بالآخر خلافتِ بنو امیہ کے اختتام کا سبب بنی۔

منصب خلافت کے لیے خلیفہ ہشام کے چار جانشیوں میں سے تین ولید ثانی، ابراہیم اور یزید ثالث انتہائی نا موزوں اور نا اہل تھے ۔ اور اکثر و بیشتر خلفاء بنو امیہ کے حرم کی رنگینیوں کے خوگر، شراب اور عیش و عشرت کے عادی تھے۔ وہ دنیا کی لطافتوں میں کھو کر اپنے فرائض سے غفلت برتنے لگے ۔ جس سے ان کا نیست و نابود ہونا ضروری تھا ۔ اور خوشحالی اور دولت کی فراوانی نے انھیں سست اور کاہل بنا دیا۔ اکثر و بیشتر آخری زمانہ کے خلفاء کنیزوں کے پیٹ سے تھے۔ جس سے بنو امیہ کی انفرادیت قائم نہیں رہی وہ جو ان کا عربی ہونا شاہی خاندان کا فخر تھا کہ اب وہ عربی خون ہونے کا دعویٰ نہ کر سکتے تھے جو ان کا طرہ امتیاز تھا۔ ان کی کاہلی، سستی اور نا اہلی کی بدولت حکومت کا نظم و نسق تباہ ہو کر رہ گیا۔ فلم حتی کے بقول

"صحرائے عرب کے بچوں کو تمدن کی آفتوں رقص و سرود، شباب و شراب نے آگھیرا جس سے عرب کے عظیم

سپوتوں اور نوخیز جوانی میں گھن لگنا شروع ہو گیا تھا۔" [1]

انہی نااہلوں کی وجہ سے بنو امیہ کی حکومت زوال پذیر ہوئی اس لیے اگر سربراہ نا اہل ہو گا تو اس کا براہِ راست اثر ادارے پر پڑتا ہے جو اس ادارے کی تباہی پر منتج ہوتا ہے۔

۲۔ سقوطِ ڈھاکہ کے اسباب حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ کے تناظر میں:

ماضی قریب میں اگر اداروں پر نااہل سربراہان کی وجہ سے ادارے کی کارگردگی پر اعتراضات ہوئے تو اس کی واضح مثال حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ ہے جس میں نااہل شخصیات کی نشاندہی کی گئی۔ جو ایک قانونی دستاویز ہے ذیل میں اس کمیشن رپوٹ کا کچھ حصہ شامل کیا جارہا ہے۔

حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ میں بیانات کی قلمبندی:

کمیشن نے یکم فروری ۱۹۷۲ء سے شہادتوں کی قلم بندی کا کام شروع کیا تھا جو ۲۶ اپریل ۱۹۷۲ء تک جاری رہا۔ بیانات اور معائنے کی غرض سے کمیشن کو (۵۷) بار بیٹھنا پڑا یعنی کمیشن نے ۲۱۳ افراد کے بیانات تحریر کیے جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے؛

۱۔ آرمی (اہل کار) جن کی تعداد ۶۱ تھی

۲۔ آرمی کے (ریٹائرڈ اہل کار) جن کی تعداد ۲۷ تھی

۳۔ ائیر فورس (ملازم اہل کار) جن کی تعداد ۳۹ تھی

۴۔ ائیر فورس (ریٹائرڈ اہل کار) جن کی تعداد ۶ تھی

۵۔ نیوی (ملازم اہلکار) جن کی تعداد ۴ ۱ تھی

۲۔ نیوی کے (ریٹائرڈ اہل کار) جن کی تعداد ۷ تھی

۶۔ سیاسی لیڈر جن کے بیان قلمبند کیے ان کی تعداد ۲۳ تھی

۷۔ سول ملازمین (ملازم اہلکار) جن کی تعداد ۱۷۔ تھی جب کہ (ریٹائرڈ اہل کار) جن کی تعداد ۶ تھی

۸۔ صحافی جن صحافیوں کا بیان قلمبند کیا گیا ان کی تعداد ۳ تھی

---

(۱) اسباب زوال امت، علامہ شکیب ارسلان، مترجم ڈاکٹر احسان بک سامی، ادارہ تحقیقات اسلامی پریس، ۲۰۱۲، دعوۃ اکیڈمی اسلام آباد ص ۶۵

۹۔ عوامی نمائندے جن کے بیان قلمبند کیے گئے ان کی تعداد ۱۰ تھی

چار ہزار صفحات پر ان گواہوں کے بیانات ٹائپ کیے گئے جب کہ ان بیانات میں پیش کرنے والی ۳۶۴ دستاویزات بھی تقریباً ٹائپ کی گئی ہیں۔ اور کمیشن کے شعبوں کے ان کاغذات اور مختلف محکمہ جات اور دستاویزات کو بھی جانچنا ضروری سمجھا جو اس سلسلے میں ان کے روبرو پیش کیے گئے تھے۔ کمیشن نے کئی حکومتی ایجنسیوں کی بے شمار ایسی معلومات لیں جو زیر غور معاملات سے متعلق تھیں۔ ساتھ ساتھ کمیشن کے علم میں اضافے کی غرض سے کچھ تجزیاتی مطالعہ بھی ترتیب دیا گیا۔ کمیشن ان امور کی پولیس اور دیگر ایجنسیوں سے تحقیقات کی غرض سے ہدایات بھی دیتا رہا۔ جو دورانے تفتیش بیانات کی جانچ پڑتال کے وقت گواہوں کی طرف سے کمیشن کو معلوم ہوئیں۔ جانچ پڑتال کے آخری دن تک لوگوں کی جانب سے تجاویز کا سلسلہ چلتا رہا جو لگ بھگ ہزار سے بھی اوپر تجاویز تھیں کمیشن بنفسِ نفیس ہر ایک گواہ کے بیان کی جانچ پڑتال کرتا جہاں جرح کی ضرورت ہوتی وہاں جرح بھی خود کرتا۔

کمیشن کو ہر قسم کا تعاون اور مدد دی گئی اور اس کی ہر ضرورت اور مطالبے کو ایک مخصوص وزارت یعنی صدارتی امور کی وزارت کے ذمے لگایا گیا اور حکومت کی طرف سے سرکاری اداروں کو پابند کیا گیا کہ وہ کمیشن کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرے اس کے نتیجے میں تمام اداروں نے پورا پورا تعاون کیا یہاں تک کہ نیشنل ڈیفنس کالج راولپنڈی میں کمیشن کو دفاتر دیے گئے۔

حمود الرحمٰن کمیشن نے خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا:

کمیشن نے تمام محکموں اور گواہوں اور دیگر افراد کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا کہ جن کے تعاون سے اتنا مشکل کام پایائے تکمیل کو پہنچا جن میں کمیشن خاص طور پر لفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) الطاف قادری، ملٹری ایڈوائزر ،تینوں مسلح افواج کے نمائندہ گان کا مشکور ہے جن کی انتھک محنت اور جذبے نے کمیشن کے کام کو مکمل کیا۔ ان لوگوں نے تحقیقات کے فوجی زاویوں سے نہ صرف مدد کی بلکہ اس سے بڑھ کر خبریں اور سٹاف سٹڈیز کی ترتیب میں بھی کمیشن کے ساتھ تعاون کیا۔ اسی طرح ائیر مارشل (ریٹائرڈ) نور خان اور وائس ایڈمرل (ریٹائرڈ) ایم ایس چوہدری کے بھی بطورِ خاص مشکور و ممنون ہیں۔ جنہوں نے ائیر فورس اور نیوی سے متعلق ہمیں اہم معلومات اور بہترین مشورے دیے۔

نااہلیت اور نا قابلیت کا نتیجہ سقوطِ ڈھاکہ:

ا۔ لفٹیننٹ جنرل امیر عبد اللہ خان نیازی جو کہ سقوط ڈھاکہ کے وقت کمانڈر انچیف تھے۔ ایک دن اعلان ہوتا ہے کہ ہم آخری دم تک لڑیں گے اور دوسرے اتنی بڑی فوج دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے اس سے پوری قوم کے ذہنوں میں اپنی فوجی حکومت کے بارے میں بے پناہ شکوک وشبہات پیدا ہوئے، قوم اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ ملک وملت کو سوچی سمجھی سازش کے تحت بے عزت اور تباہ کرنے کا ایک مجرمانہ منصوبہ تھا۔ جس کے نتیجے میں قوم نے یہ آواز اٹھائی اس شکست کے ذمے داروں پر کھلے عام مقدمہ چلا کر انہیں کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ عوام نے اپنی اس بات کے لیے شدید احتجاج کیا جس کی وجہ سے اس وقت کے ڈپٹی پرائم منسٹر جناب ذوالفقار علی بھٹو کو تمام مصروفیات ترک کر کے ملک لوٹنے کو کہا گیا۔ جو اس وقت امریکہ کے دورے پر سکیورٹی کونسل کے اجلاس میں پاکستانی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے شریک تھے۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو کے پاکستان پہنچنے پر ۲۰ دسمبر کے دن اس وقت کے فوجی حکمران جنرل یحیٰ خان نے ذوالفقار علی بھٹو کو اقتدار دے دیا۔

۲۔ عوام کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے انہوں نے اقتدار سنبھالنے کے بعد فوری طور پر اس کمیشن کے قیام کا اعلان کیا اور ایک نوٹیفکیشن جاری کیا گیا (۲۶ دسمبر ۱۹۷۲ء) جس کے تحت کمیشن کے دائرہ کار کو واضح کیا گیا جس میں کمیشن کے ذمے لگایا گیا کہ کمیشن اس شکست کے اسباب کی تحقیقات کرے ۔ کہ کیوں کر پاکستان کی مسلح افواج کے کمانڈران نے دشمن کی فوج کے آگے ہتھیار ڈالے ؟۔ انڈیا، مغربی پاکستان کی سرحدات اور کشمیر سیکٹر میں جنگ بندی کا اعلان کیوں کیا گیا؟۔[1]

۳۔ کمیشن کے ممبران عدالت کے رکن ہونے کی وجہ سے فوجی معاملات، فوجی طریقہ کار، جنگی معاملات اور حکمت عملی سے کماحقہ واقف نہ تھے۔ جس سے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ اتنے بااختیار اعلیٰ کمیشن اور وسیع دائرہ کار دینے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس وقت کی ذمہ دار شخصیات کو شامل کئے بنا سچائی کو ہر زاویئے سے پرکھ کر سامنے لایا جاسکے۔ اور پاکستان کی عوام کو اصل صورتِ حال کا علم ہو سکے اور انہیں اس عظیم واقعے کے وقوع پذیر ہونے کی وجوہات اور اسباب کا علم ہو سکے جس سے ان کے اذہان بلکل صاف ہو سکیں کہ میڈیا جو خبریں دے رہا ہے وہ صحیح ہیں حقائق پر مبنی ہیں یا جو الزامات لگائے جارہے ہیں وہ بے بنیاد قسم کے الزمات ہیں یا ان میں صداقت ہے۔ اگر ان میں صداقت ہے تو پھر ہمارے قومی مجرم کون سے ہیں ان کی نشاندہی ہو اور اس جرم کی پاداش میں ان کو کیفرِ کردار تک

---

(۱) حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ، آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا

پہنچایا جائے۔ اور اگر الزامات بے بنیاد ہیں تو پھر یہ واقعہ کیسے پیش آیا کہاں گڑبڑ تھی کہاں کوئی خامی تھی یا کیا کمی کوتاہی تھی جو اتنے بڑے سانحہ کا سبب بنی۔

۴۔ اس وقت افواجِ پاکستان کے کچھ لوگوں نے اس عدالتی کمیشن پر اپنے ذہن میں موجود خدشات ظاہر کئے۔ جس میں ان حضرات کا کہنا یہ تھا کہ یہ عدالتی کمیشن چونکہ صرف عدالتی ہے یعنی اس کے ممبران میں عدلیہ کے لوگ ہیں یہ نہ تو فوجی معاملات، فوجی طریقہ کار، جنگی معاملات اور حکمت عملی سے واقف ہیں جب کہ یہ ایک خالص فوجی حکمت عملی کا عملی معاملہ ہے اس لیے اس کے لیے یہ لوگ موزوں نہیں ہیں۔ یہ بات بلکل واضح تھی کہ شکست اور صدمہ کے ان حالات میں اس طرح کا کمیشن، تحقیقات کوئی معمولی بات نہ تھی۔ پہلے سے ان کے دل زخمی تھے اوپر سے اس قسم کا کمیشن بنانا اور تحقیقات کا سامنا کرنا یقیناً تکلیف دہ چیز تھی۔ جس کے متعلق بعد میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ ایک زیادہ بااختیار صدارتی کمیشن بنتا جس میں عدلیہ کے ساتھ ساتھ مسلح افواج کے حاضر سروس اور ریٹائرڈ لوگوں کو شامل کیا جاتا تو وہ اس سے بہتر تحقیقات کر سکتا تھا۔

حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ میں شکست کے ذمہ داران کا تعین:

سقوطِ ڈھاکہ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ اس کا پس منظر کیا ہے؟ یہ ایک طویل بحث ہے جس کا یہاں ذکر کرنا موضوع سے الگ ہونا ہے البتہ حمود الرحمٰن کمیشن نے ان ذمہ داروں کا تعین کیا ہے جن کے سبب قوم کو اپنا ملک دو لخت ہوتا دیکھنا پڑا۔ اگر عام فہم الفاظ میں سمجھا جائے تو وہ یہ ہے کہ سقوطِ ڈھاکہ نااہلی کی وجہ سے ہوا۔

اداروں پر سربراہان کے اثرات اہلیت کے تناظر میں:

مذکورہ بالا بحث کے بعد اب اداروں پر اہل اور قابل سربراہوں کی تعیناتی اداروں کی کارکردگی پر اچھے اثرات مرتب کرتی ہے اور اداروں کی سربراہی تفویض کرنے کے لیے بنیادی شرط قابلیت اور اہلیت ہے۔ عہد نبوی سے ہی اداروں میں تعیناتی اہلیت کی بنیاد پر کی جاتی تھی۔ ذیل میں اس کا ذکر کیا جارہا ہے۔

عہدِ نبوی میں عہدوں کی تقسیم اہلیت کی بنیاد پر:

قرآن کریم کا مطالعہ اور قرآن کریم کی روح اور تعلیماتِ نبوی کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کے اُمور ومعاملات کا نظم و نسق چلانے کے لیے صرف اہل اور قابل شخص یا اشخاص کا تقرر ہونا چاہیئے۔
نیز اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ امانتیں ان کے اہل لوگوں کو دیں اسلامی حکومت میں حکومتی عہدہ ایک امانت ہے۔ جو کہ اہل اور حق دار کو دی جانی مناسب ہے۔ اللہ ربّ العزت کا ارشاد ہے کہ

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأمُرُكُم أَن تُؤَدُّوا الأَمـٰنـٰتِ إِلىٰ أَهلِها وَإِذا حَكَمتُم بَينَ النّاسِ أَن تَحكُموا بِالعَدلِ ۚ إِنَّ اللَّهَ نِعِمّا يَعِظُكُم بِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كانَ سَميعًا بَصيرًا ﴾[1]

ترجمہ: بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل لوگوں کو دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔ اللہ تمہیں اچھی نصیحت کرتا ہے۔ بے شک اللہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

قرآن کا بنیادی تعلق صحیح اور غلط یا خیر و شر جیسے اخلاقی نوعیت کے معاملات سے ہے ، منصوبہ سازی سے نہیں۔ سیاسی تقرریوں کا معاملہ دراصل صحیح و غلط انتخاب کے انتظامی اُمور سے ہے جبکہ منصب پر تقرری کا طریق کار اور عملے کا چناؤ حالات حاضرہ کی روشنی میں منصوبہ سازی اور معیار قابلیت پر مقرر کرنے پر منحصر ہے۔

عہدِ نبوی میں صلاحیتوں کے مطابق تفویضِ امور:

صفّہ تربیت گاہ میں حضور نبی کریم ﷺ کی سرپرستی میں بچوں کی تعلیم اور تربیت کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کو مختلف امور میں تخصصّ بھی کرایا جاتا تھا۔ جن کو شریکِ مشاورت کرنا ہوتا ان کو مختلف امور میں مکمل مہارت دلوانے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ جس کی کچھ مثالیں درج ذیل ہیں :

ا۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حضور نبی کریم ﷺ نے اپنا چیف سیکرٹری مقرر کیا تھا جن کے ذمے تمام معاہدات اور دستاویز کا لکھنا، خطوط کا بھیجنا، کھولنا، ڈاک بھیجنا اور مختلف خفیہ دستاویز، مختلف امور نمٹانا، رابطہ وغیرہ سارے ان کے ذمے ہوتے تھے کیونکہ وہ لکھنے پڑھنے کے امور کے انچارج اور چیف سیکرٹری تھے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کو فارسی، یونانی، حبشی اور عبرانی زبان سکھانے کا اہتمام فرمایا۔ گویا ان کو کئی زبانوں کا ماہر بنایا۔ وہ تمام زبانیں اس لیے آپ کو سکھائیں تاکہ جس قبیلے کو خط و کتابت کرنی ہو یا معاہدات تیار کرنا ہو، رابطہ کرنا ہو تو وہ اسی زبان میں کریں۔[2]

حضور نبی کریم ﷺ نے گلوبلائزیشن کا تصور کس طرح شروع فرمایا۔ اگر ایک ہی زبان پر اصرار کرتے کہ جس نے بات کرنی ہے تو ہماری زبان میں ہی کر لے یا اس کا ترجمہ کر لے، لیکن چونکہ اسلام کی وسعت اور گلوبلائزیشن کو بھی نمایاں کرنا تھا اس لیے وہ زبانیں بھی سکھائیں۔

---

(۱) سورۃ النساء: ۴/۵۸

(۲) عہد نبوی میں نظام حکمرانی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، باب الاسلام پرنٹنگ پریس کراچی، ۱۹۸۱، ص ۲۸۹

بعد ازاں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے تحت مزید کاتب اور سیکرٹریز بھی رکھے۔ سیکرٹریز میں علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی تھے اور یہ سب نوجوان تھے۔ (۱)

2۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ جوان تھے ان کو کمانڈر/ سپہ سالار بنایا اور بڑی بڑی اہم مہمات پر بھیجا۔ (۲)

3۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کو جب جنگ خیبر کے موقع پر عَلم عطاء فرمایا تو ان کی عمر تقریباً پچیس برس تھی۔ (۳)

5۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ایک مرتبہ چیف جسٹس بھی بنا کر بھیجا۔ اور اسی طرح آپ کو ایک مرتبہ ڈائریکٹر جنرل برائے ایجوکیشن بنا کر بھی بھیجا۔ امام طبری تاریخ میں لکھتے ہیں کہ ان کی ذمہ داری یہ تھی وہ ایک ایک شہر، ایک ایک ضلع اور ایک ایک گاؤں جا کر سکولوں اور تعلیمی مراکز کی خود نگرانی کرتے اور رپورٹ لیتے تھے اور تعلیم کے نظام کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اس طرح آپ نے اس نظام کو مستحکم کیا۔

الغرض جس کے اندر جو صلاحیتیں تھیں اس کو دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صلاحیتوں کو نکھارا اوراجاگر کیا تاکہ یہ بہتر مشاورت میں کارآمد ہو، اور آگے بہتر ذمہ داریاں اٹھا سکیں۔

6۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ چونکہ ریاضی میں اچھے تھے ان کوریاضی کے متعلقہ امور کی ذمہ داری تفویض کی۔ کسی کو ریاضی میں، فقہ میں، تجوید میں، قانون میں، غزوات میں ، فوج میں اور کسی کو دیگر معاملات میں ان کی اہلیت کے مطابق ذمہ داریاں سونپیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، حضرت عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، یہ سب صحابہ ہجرت کے وقت جوان تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لیڈر شپ کے لیے تیار کیا۔ کارکنوں سے شروع کر کے لیڈر بننے تک ایک وقت لگا پھر وہ وقت کے خلفاء بنے اور اہم نوعیت کی ذمہ داریاں سرانجام دیں۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ وحضرت

---

(۱) عہد نبوی میں نظام حکمرانی، ص ۲۹۰

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً

عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ابھی نو عمر ہی تھے کہ ان کو بھی اس وقت ان کاموں میں شامل کر دیا، ان کی تربیت فرمائی اور پھر وہ اپنے وقت کے امام بنے۔[1]

7۔ اسی طرح اگر کسی میں کھیل کی صلاحیتیں دیکھیں تو اس کو کھیل میں لگادیا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھیلوں میں مقابلے خود کروائے۔ نیزہ بازی، گھڑ دوڑ اور دوڑوں کے مقابلے کروائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے، دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والوں کو انعام دیتے۔ ہر ایک شعبے میں لوگوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا، مواقع دیئے اور ان کو معاملے میں شریک کیا۔[2]

سورۃ الحجرات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کی تربیت فرمارہے رہے تھے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ :

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ﴾[3]

ترجمہ: اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کیا کرو کہیں کسی قوم پر بے خبری سے جا نہ پڑو پھر اپنی کیے پر شرمندہ ہونے لگو۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صلاحیتوں کو مضبوط اور پختہ بھی کر رہے تھے تاکہ شخصیت سازی ہو اور لیڈر شپ بھی تیار ہو اور پروان چڑھے۔ پھر جمہوری نظام کو فروغ دینے کے لیے ان کو شریک مشاورت کر کے ایک تربیت کے نظام میں بھی گذار رہے تھے۔ مگر ساتھ ہی ان کو یہ تربیت دی جارہی تھی کہ کبھی یہ سمجھ نہ لینا کہ پیغمبر ہماری رائے کا محتاج ہے یا ہماری عقل و شعور پیغمبر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر ہوگئی ہے۔ رائے مختلف تو ہو سکتی ہے مگر یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم برابر ہوگئے ہیں۔ اس حالت کو روکنے کے لیے اور ایمان سے محرومی اور کفر کی طرف بڑھنے سے روکنے کے لیے فرمایا واعلمو ان فیکم رسول اللہ کہ جو تم سے بیٹھ کر مشورے فرما رہے ہیں، یہ تمہارے مشوروں کے محتاج عام انسان یا لیڈر نہیں بلکہ یہ خالقِ کائنات کے پیغمبر ہیں۔ ان کے پاس اس کی ہدایت ہے،یہ تمہارے مشوروں کے محتاج نہیں ہیں۔ یہ تمہاری بہتری اور اصلاح کے لیے، ایک سسٹم کو مستحکم کرنے کے لیے اور آئندہ امت کو سنت عطا ءکرنے کے لیے تم سے مشاورت فرما رہے ہیں۔

---

(۱)عہد نبوی میں نظام حکمرانی، ص۲۹۳

(۲)ایضاً

(۳)سورۃ الحجرات۴۹/۶

حضرت محمد ﷺ صاحبِ بصیرت و حکمت:

اگر رسول کریم ﷺ اپنے تہیں تم سے مشاورت کریں اور کوئی تجویز یا رائے طلب کریں تو ان کی بصیرت کی بلندی کے پیش نظر وہ اس سے بہت بہتر علم رکھتے ہیں اور بہتر حکمت بھی انہیں معلوم ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو اعلیٰ فراست سے نوازا گیا وہ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریتی رائے کو دیکھ کر اپنی رائے کو چھوڑتے ہیں تو اس میں بھی کئی حکمتیں پنہاں ہوں گیں۔

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ ۚ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ﴾ (۱)

اگر تم چاہو ہماری اکثریت کی رائے مانی جائے۔ ۔ ۔ تم خواہش کرو، مطالبہ کرو، دباؤ ڈالو کہ ہماری رائے مانی جائے اور رسول اللہ ﷺ اپنی رائے چھوڑ دیں تو تب قرآن نے فرمایا اگر وہ تمہاری کثرتِ رائے مان کر، اپنی بات چھوڑ کے تمہاری مان لیں مگر اس فیصلے کے بعد جو کچھ تم پر بیتے گا تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ ۔ ۔ تم مشکل میں پھنس جاؤ گے کیونکہ جو کچھ رسول اللہ ﷺ کی نگاہ دیکھ رہی ہے وہ تمہاری نگاہیں نہیں دیکھتیں۔ ۔ ۔ کچھ باتیں وہ ہیں جو مشاورت کے اندر آرہی ہیں اور وہ جو پردے سے پار اور اِس حد سے پار نبی کریم ﷺ کی نگاہ میں ہے ۔ان کی نگاہِ فراست، نگاہ حکمت، نگاہ بصیرت، نگاہ نبوت اور نگاہِ رسالت کچھ اور چیزیں دیکھ رہی ہے جن کا ادراک تمہیں نہیں ہے۔ ۔ ۔ لہذا انہی کا حکم مانو، اگر وہ تمہاری بات ماننے لگیں تو تمہیں ایسی مشکلیں پیش آئیں کہ پھر تم بچ نہ سکو۔

---

(۱) سورۃ الحجرات ۴۹/۷

فصل چہارم:

اسلامی وجمہوری ریاست کے مابین تصادم اور اس کا حل

اسلامی وجمہوری ریاست کے مابین تصادم اوراس کا حل:

جمہوریت الہام کی گئی کوئی چیز نہیں بلکہ انسانوں کی سعی ہے جو بتدریج تجربات کے بعد موجودہ صورت میں گڈ گورننس کے لیے مفید پائی گئی ہے۔ مغربی دنیاجمہوریت کے ثمرات اور فوائد میں بہت آگے ہے۔ لیکن تیسری دنیا اور کچھ اسلامی ملک اپنی جہالت، پسماندگی اوراپنی بدعنوانیوں کی وجہ سے جمہوریت کے اصل فوائد اور ثمرات سے بہت دور ہیں۔ ان ممالک میں جمہورت برائے نام ہے جس کی وجہ سے جمہوری نظام ناکام ہے۔ جس کی ناکامی کا سارا ملبہ جمہوریت پر ڈالا جاتا ہے۔ اور جمہوریت کے بارے میں کئی قسم کے اعتراضات اٹھائے جاتے ہیں۔ مثلا جمہورت اسلام کے خلاف ہے اسی طرح یہ نظام کفر ہے اس کے ماننے والے مسلمان ہی نہیں ہیں۔ وہ جمہوریت کے متبادل خلافت کو پیش کرتے ہیں۔ جو مسلمانوں کے شروع دور میں رائج رہی اب دنیامیں کہیں بھی رائج نہیں جبکہ اس وقت دنیا میں رائج نظاموں میں جمہوریت کا نظام ایسا نظام ہے جو اسلامی ممالک میں آکر اسلامی جمہوریت کے نام سے رائج ہے۔ اسلام کے نظام حکومت شریعت اسلامی میں شوریٰ اور عدل و انصاف کے ایسے اصول ہیں جو شروع سے چلے آرہے ہیں جو ہر معاشرے اور ہر دور میں مشعل راہ ہیں اوراسلامی جمہوری نظام کے تحت ان سے استفادہ کیاجاسکتاہے۔

اسلام مسلمانوں کو کسی ایک خاص نظام حکومت کا پابند نہیں بناتا اور نہ ہی اسلام کے نفاذ سے یہ مراد لیا جاتا ہے کہ یہ ایک مخصوص نظام کا قیام ہے۔ بلکہ اسلامی تعلیمات کو نافذ کرنا اصل میں اسلامی قوانین اور اصول وضوابط کو قائم کرنے کا نام ہے۔ اگر دیکھا جائے جو جمہوری اصول اسلام سے ٹکراؤ کھاتے ہیں تو اسے اسلامی اصولوں سے تبدیل کر دیا جائے۔ جیسا کہ جمہوریت کا ایک اصول ہے عوام کی حاکمیت جو کہ مغربی جمہوریت کا تصور ہے لیکن ہمارے آئین نے اس کو قرآن وسنت کے مطابق قانون سازی کے ساتھ لازم کرکے اس کا اسلامی حل دیاہے۔ یعنی قرآن وسنت کے مطابق قانون سازی کرنا لازم ہے اگرچہ عوام کی اکثریت اس کے خلاف ہو۔ اس طرح سے جمہوریت اسلام کے رائج کرنے میں کسی طرح بھی رکاوٹ نہیں بنتی۔ بلکہ جمہوریت کے اصولوں کو دیکھاجائے تو ان اصولوں سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ کیاجائے۔ اس لیے کہ بات بلکل واضح ہے کہ پاکستان میں اکثریتی آبادی مسلمانوں کی ہے اور یہ اکثریتی آبادی نفاذ اسلام کی تمنااور خواہش رکھتی ہے۔

جب سے بنی نوع انسان کی آمد ہوئی ہے اس دنیاپر تواس کے ساتھ ساتھ ریاست ومملکت کاوجود اور بہترین نظام اور لوگوں کی فلاح و بہبود اور آزادی کے تصورات اور نظریات نے بھی اپنی آمد کا سلسلہ جاری رکھاہے۔ اس نظریئے اور تصور نے اس بات کو اہمیت دینے کی کوشش کی کہ ریاست کا نظام اس طرح سے ترتیب دیاجائے جو نظام ریاست میں رہنے والوں کی فلاح وبہبود، آزادی اور تمام سہولیات دینے کی ذمہ دار ہو۔ باشندوں کو ہر طرح سے تحفظ

دیا جائے اور ان کو انصاف بھی میسر ہو۔اس کی ایک شاخ جمہوریت بھی ہے جو البتہ ابھی دنیا کے بیشتر ملکوں میں مقبول ترین نظام ہے۔ دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو کئی ریاستوں اور ممالک نے یا تو آمریت سے یا بادشاہت سے چھٹکارا حاصل کر کے جمہوریت کو اپنایا ہے۔ جمہوریت کو عام فہم زبان میں عوام کی حکومت کہتے ہیں۔ جمہوری نظام میں اس طرح کہا جاتا ہے کہ اقتدار کی طاقت اور منبع عوام ہیں۔ جمہوریت کی ابتداء مغرب سے ہوئی لیکن جب اسلامی ممالک نے اسے اپنے ہاں جگہ دی تو جمہوریت کا ایک نیا انداز سامنے آیا جس کو اسلامی جمہوریت کا نام دیا گیا۔ جو کہ اس وقت اسلامی دنیا کے بیشتر اسلامی ممالک میں رائج ہے مگر جمہوریت پر یہ سوال اٹھا کہ جمہوریت اسلامی ہے یا غیر اسلامی اس پر ایک نہ ختم ہونے والی بحث کے سلسلہ کا آغاز ہوا جو اب بھی جاری ہے۔

جمہوریت نبی کریم ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں:

ید اللہ علی الجماعۃ : (یعنی مسلمانوں کی ریاست) پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ جب کوئی اس سے الگ ہوتا ہے تو اسے شیاطین اچک لے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے جب تم لوگ کوئی بڑا اختلاف دیکھو، تو (عمل کے معاملے میں) اکثریتی گروہ کی پیروی کرو۔ کیونکہ جو ریاست سے الگ ہوا، اسے الگ کر کے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔"(۱)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"جب تم اختلافات دیکھو تو اکثریت کی رائے کی پیروی کرو۔"(۲)

ظاہر ہے کہ اختلافات کے باوجود نظام تو چلانا ہے، کاروبار زندگی تو معطل نہیں کیا جا سکتا، اس لیے اس مسئلے کا اس کے سوا کوئی حل نہیں کہ اکثریت کی بات پر عمل شروع کر دیا جائے۔ اس میں یہ ہو سکتا ہے کہ کبھی اکثریت کی بات صحیح نہ ہو، مگر اجتماعی شعور رکھنے والے جانتے ہیں کہ معاملات، بہر حال اسی بات کے مطابق چلانا ہوں گے۔ البتہ دوسری رائے رکھنے والے اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔ دلیل اور تہذیب سے دوسروں کو قائل کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اکثریت کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ان کی رائے آپ سے آپ قانون بن جائے گی۔

ہمارے ہاں جمہوری نظام کو چار بنیادی اور اصولی نکات کی بنیاد پر اسلام سے متصادم قرار دیا جاتا ہے:

ا۔ سوال اٹھایا جاتا ہے کی جمہوریت کفر اور شرک ہے۔

جمہوریت کی بنیاد کو اگر سرسری طور پر دیکھا جائے تو اس نظام میں حاکمیت کا اصل منبع عوام کو مانا جاتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جس کی وجہ سے یہ بات اٹھائی جاتی ہے کہ جمہوریت اسلام سے متصادم نظام ہے۔ کیونکہ اسلام

---

(۱)المستدرک علی الصحیحین، امام ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ حاکم نیشاپوری الحاکم نیشاپوری ناشر دارالمعرفۃ بیروت ،۱۴۱۸ھ، مترجم شاہ محمد چشتی، یو اینڈ می پریس لاہور ۲۰۰۹، ص ۲۴۰

(۲)ابن ماجہ، کتاب الفتن، ابو عبد اللہ محمد بن یزید ابن ماجہ الربعی القزوینی، دار السلام پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۶، ص ۲۳۵

میں حاکمیت اعلیٰ کا مالک فقط اللہ کی ذات کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ جمہوریت کی جائے پیدائش یعنی مغرب میں جمہوریت سے مراد عوام کی حاکمیت ہے۔ ان کے ہاں عوام کی اکثریت جو چاہے قانون بنالے چاہے وہ قانون معاشرتی اقدار سے متصادم ہو چاہے اخلاقی اقدار کے منافی ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا بس اگر عوام کی اکثریت کی تائید ہے تو قانون بن جائے گا۔

جواب:

اسلامی جمہوری نظام میں یہ اختیار نہ کسی گروہ نہ کسی جماعت نہ کسی فرد کو دیا گیا ہے کہ وہ اپنے آراء سے اللہ کے احکامات میں ردوبدل کر سکیں۔ جس طرح مغرب میں وہاں کی پارلیمنٹ اکثریتی رائے سے ہم جنس پرستی اور مرد کی مرد سے شادی کا قانون بنالیتی ہے لیکن ہمارے ملک کا آئین اس طرح کے قوانین کا راستہ روکتا ہے۔ کوئی بھی ایسا قانون پارلیمنٹ منظور نہیں کر سکتی جو قرآن مجید اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کے احکامات سے متصادم ہو۔ اسی طرح ہمارے ملک کی پارلیمنٹ آئینِ پاکستان کی اسلامی شناخت کو ختم نہیں کر سکتی چاہے دو تھائی اکثریت ہی کیوں نہ ہو۔ اگر بالفرض ایسا ہو تو سپریم کورٹ اسے کالعدم کر دے گی کیونکہ یہ آئینِ پاکستان کے اسلامی تشخص کے خلاف ہے۔

۲۔ اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس نظام میں اکثریت کی بات تسلیم کی جاتی ہے اور اکثریت گمراہی کا سبب بنتی ہے۔

اس اعتراض کی بنیاد قرآن کریم کی دو آیات ہیں۔

ا۔ سورۃ الانعام کی آیت نمبر ۱۱۶ میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں اگر اکثریت کی اطاعت کرو گے تو یہ تمہیں اللہ ربّ العزت کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ اب جمہوریت کی بنیاد ہی اکثریت کی بات ماننے پر ہے لہٰذا جمہوریت بنیادی طور پر اسلام سے متصادم ہے۔

۲۔ سورۃ النساء میں اور کئی دوسرے مقامات پر اللہ کا حکم ہے کہ اللہ ربّ العزت کی اور رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کی اطاعت ہونی چاہیئے نہ کہ عوام کی رائے سے بننے والے قوانین کی ۔ کیونکہ اگر آپ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو اختیار کریں گے تو اس سے قرآن و سنت کی بالادستی ختم ہو جائے گی۔ اور عوام کی بالادستی قائم ہو جائے گی۔

جواب:

مذکورہ بالا آیات قرآن کریم کی ہیں جن پر عمل کرنا ضروری اور لازمی امر ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت کرنا کہ اس سے جمہوریت کی نفی ہوتی ہے یہ صحیح نہیں ہے۔ ذرا ملاحظہ ہو کہ سورۃ الانعام کی آیتِ مبارکہ میں اللہ کا فرمان ہے:

﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَمَنْ فِی الْاَرْضِ يُضِلُّوْکَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلاَّ الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلاَّ يَخْرُصُوْنَ﴾[1]

ترجمہ: اوراگر تم اطاعت کروگے زمین میں بسنے والے اکثرلوگوں کی تووہ تمہیں گمراہ کر ڈالیں گے، وہ تو وہم وگمان کے سوا کسی چیز کے پیچھے نہیں چلتے، اور ان کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ خیالی اندازے لگاتے رہیں۔

آیت مبارکہ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو اپنے دین کی بنیاد محض اندازوں پر رکھتے ہیں جن کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے صرف اندازہ اور خیال ہے جس پر یہ مجتمع ہوئے ہیں یہاں یہ بات بیان کرنا مقصود ہے کہ عموماً اکثر لوگ گمراہی پر ہوتے ہیں اور بے دلیلے ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر اللہ کو چھوڑ کر ان کی اتباع کروگے تو گمراہ ہو جاؤگے۔ کیوں کہ عوام کی اکثریت یا تو اپنے آباؤاجداد کی پیروی کرتے ہیں چاہے وہ حقپ پر ہوں یا نہ ہوں، یا عوام کی اکثریت رسم ورواج کے پیچھے چلتی ہے اور دین کو پس پشت ڈال دیتی ہے ایسے لوگوں کی اتباع سے منع کیا جارہا ہے۔ مطلب یہ کہ ایک حقیقت سمجھانی مقصود ہے نہ کہ اصول بیان کیا جارہا ہے۔ کیونکہ اگر اس کو ایک اصول مان لیا جائے تو اسلام کا اجتماعیت کا مزاج ختم ہو کے رہ جائے گا جس پر قرآن مجید کی کئی آیات دلالت کرتی ہیں اور بہت ساری احادیث میں جماعت کی اہمیت وارد ہوئی ہے۔ اس آیت میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ صرف اکثریت سچائی کی دلیل نہیں ہے اگر اکثریت کی رائے اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر ﷺ کی تعلیمات سے متصادم ہے تو باوجود اکثریت کے غلط ہے جس کی پیروی سوائے گمراہی کے کچھ نہیں۔

قرآن کریم کی اس آیتِ مبارکہ کے سیاق وسباق کو ہٹا کر (out of context) پیش کیا جاتا ہے۔ جو اسلام کے مخالفین کا طریقہ کار ہے۔ ایک مرتبہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بات پر غور کر رہے تھے کہ کس طرح امّتِ محمد ﷺ اختلافات کا شکار ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اپنی سوچ کا اظہار حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کیا اور فرمایا اے ان عباس رضی اللہ عنہما کہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح یہ امّت اختلافات کا شکار ہو سکتی ہے ان کا نبی ایک، قبلہ وکعبہ ایک، ان کی طرف نازل کردہ کتاب ایک، پھر بھی یہ اختلافات میں پڑ جائے گی۔؟ جو کہ ان سب کے ایک ہوتے ہوئے ممکن نہیں لگتا۔ جس پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے جواب میں ارشاد کیا کہ: اے امیر المؤمنین آپ ٹھیک فرمارہے ہیں کہ قرآن ایک ہوتے ہوئے کیسے اختلافات میں پڑ سکتے ہیں کیوں کہ یہ قرآن ہمارے ہوتے ہوئے نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا۔ ہم نے اسے نبی کریم ﷺ سے پڑھا اور ہمیں علم ہے کہ کون سی آیت کس کے متعلق نازل ہوئی۔ لیکن ہم سے بعد میں آنے والی امّت قرآن کریم تو پڑھے گی

---

(۱) سورۃ الانعام: ۶/۱۱۶

لیکن ان کو یہ پتہ نہیں ہو گا کہ کونسی والی آیت کس کے متعلق نازل ہوئی ہے وہ اس آیت کے متعلق اپنی اپنی آراء قائم کریں گے جو ایک کی رائے دوسرے کی رائے سے الگ ہو گی اور یہی سبب ہو گا اختلاف کا۔

امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

> ابن عباس رضی اللہ عنہما نے درست ارشاد کیا کہ آیت کا شانِ نزول معلوم ہو تو پھر آیت کا مصداق کون ہے اس سے آیت تفسیر اور شارع کی اس سے کیا منشاء مراد ہے یہ سمجھ میں آجاتا ہے جو بھٹکنے کا سبب نہیں بنتا لیکن اگر ان باتوں کا علم نہ ہو تو پھر اپنی رائے سے کوئی بات بنانی ہے تو اس میں ہر طرح کا احتمال آسکتا ہے جو بسا اوقات اپنی اور دوسروں کی گمراہی کا سبب بنتا ہے۔(۱)

یہ بات مزید واضح ہوتی ہے واقع حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ سے ان سے پوچھا گیا کہ جلیل القدر صحابی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا خوارج کے بارے میں کیا خیال تھا تو حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہ خوارج کو اللہ کی بدترین مخلوق میں شمار کرتے تھے اس لیے کہ کفار کے بارے میں نازل شدہ آیات کو مسلمانوں پر ثابت کرتے ہیں۔

سورۃ الانعام کی آیت مبارکہ جو اوپر مذکور ہوئی ہے میں گمراہ سے مراد کفار ہیں اس اکثریت کا ذکر ہو رہا ہے کہ وہ اللہ کی راہ سے بھٹکے ہوئے روزِ آخرت پر ایمان نہیں لائے لہٰذا ایسے لوگوں کی پیروی سے بچیں وہ تمہیں یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ تعالیٰ کے راستے سے بھٹکا دیں گے کیونکہ وہ خود صرف خیال کے متبعین ہیں۔

اس کے بعد مسلمانوں کی بات کریں تو مسلمان تو اس سے بلکل الگ ہیں مثلاً مسلمان اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر، قرآن پر، آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ مسلمان تو ہدایت کی تلاش میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے در پر جاتے ہیں چہ جائے کہ مسلمان نعوذ باللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گمراہی کا سبب بنیں۔ یہ بات بھی عیاں ہے کہ مسلمان اپنا دین قرآنی تعلیمات اور احادیث نبوی سے لیتے ہیں نہ کہ گمراہوں سے لیتے ہیں۔ آج دین کی تباہی کا سبب بھی یہی ہے کہ دین کی ترجمانی گمراہ لوگ کر رہے ہیں۔ جب کہ دین کا منبع و مرجع قرآن و سنت ہے۔

جمہوری عمل میں جو جدت ہے یا بہتری کی صورتیں ہیں وہ بے شک کفار یا ملحدین سے لی جاتی ہیں لیکن جہاں دین کا نام آتا ہے تو مسلمانوں کا رجوع قرآن کریم اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہی ہوتا ہے۔

اور یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ جمہوری عمل سے مسلمانوں کا انتخاب کیا جاتا ہے ووٹ ڈالنے والے مسلمان ووٹ جس کو مل رہے ہیں وہ مسلمان اس میں کفار سے تو کوئی بات نہیں لی جاتی البتہ اتنا ضرور ہے کہ کفار یا مغرب کے ہاں چناؤ کا یہ طریقہ رائج ہے ہم بھی بطورِ ایڈمنسٹریشن اس طریقے پر عمل کرتے ہیں۔ جس سے نہ

---

(۱) الاعتصام، ابی اسحاق ابراہیم بن موسیٰ بن محمد الشاطبی، مکتبہ التوحید، بیروت ج ۲، ص ۶۹۲

ہمارے ایمان کو کوئی خطرہ ہے نہ ہی ہمارے دین کو بس انتخابات کا ایک طریقہ ہے لیکن اگر اس سے بہتر طریقہ انتخاب کا مسلمان نکال لیں تو مسلمان اس پر عمل پیرا ہو جائیں گے۔

مسلمانوں کے لیے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:" ید اللہ علی الجماعۃ"

ترجمہ: اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ یعنی اللہ کی مدد جماعت کے ساتھ ہے اکثریتی لوگوں کے ساتھ لہٰذا جو جماعت سے الگ ہوا تو وہ شیطان کے ہتھے چڑھ گیا، کیوں کہ جو جماعت سے الگ ہوا وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔[1]

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ جب تم اختلاف دیکھو تو جماعت کی پیروی کرو یعنی جس طرف زیادہ لوگ ہوں[2]

آیت مذکورہ بالا میں یہ بتایا جارہا ہے کہ جب حق و باطل کے درمیان فیصلہ کی نوبت آئے گی تو اس وقت اکثریت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس کی مثال اس طرح دی جاسکتی ہے کہ اگر پوری کائنات اس بات پر متفق ہو جائے کہ اللہ وحدہ لاشریک نہیں ہے تو ایک اکیلا مسلمان دوسری طرف ہو تو اس ایک کی پیروی درست اور باقی اکثریت کی پیروی گمراہی اور کفر کہلائے گی۔ مطلب صاف ظاہر ہے کہ ایک طرف سچائی ہے اور دوسری طرف جھوٹ یا کفر ایسی صورت حال میں حق و سچ کا فیصلہ دلیل سے ہو گا اقلیت یا اکثریت کی بنیاد پر نہیں ہو گا۔ لہٰذا مذکورہ بالا آیت مبارکہ سے یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ اگر حق سچ کے ساتھ کھڑے ہو تو پوری کائنات آپ کے خلاف ہو اس کی پرواہ کئے بغیر اس پر قائم رہو اکثریت کی پرواہ نہ کرو۔ سورۃ الانعام کی اس آیت کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے اس سے پہلے کی تین آیات یعنی ۱۱۲ سے ۱۱۶ کو ملا کے پڑھنے سے اس کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے کہ اس میں حکومت یا طرزِ حکومت بیان نہیں ہو رہی سابقہ آیات کا ترجمہ بیان کرنے سے بات واضح ہو جائے گی:

ترجمہ: "(اور جس طرح یہ لوگ ہمارے نبی سے دشمنی کر رہے ہیں) اسی طرح ہم نے ہر (پچھلے) نبی کے لیے کوئی نہ کوئی دشمن پیدا کیا تھا، یعنی انسانوں اور جنات میں سے شیطان قسم کے لوگ، جو دھوکا دینے کی خاطر ایک دوسرے کو بڑی چکنی چپڑی باتیں سکھاتے رہتے تھے اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کر سکتے، لہٰذا ان کو اپنی افتراء بازیوں میں پڑا رہنے دو۔ (۱۱۲) اور (وہ انبیاء کے دشمن چکنی چپڑی باتیں اس لیے بناتے تھے) تاکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کے دل ان باتوں کی طرف خوب مائل ہو جائیں اور وہ ان میں مگن رہیں، اور ساری وہ حرکتیں کریں جو وہ کرنے والے تھے۔ (۱۱۳) (اے پیغمبر ﷺ ان لوگوں سے کہو کہ) کیا میں اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو فیصل بناؤں، حالانکہ اسی نے تمہاری طرف یہ کتاب نازل کر کے بھیجی ہے جس میں سارے (متنازعہ) معاملات کی تفصیل موجود

---

(۱) المستدرک، حافظ ابی عبد اللہ محمد بن عبد اللہ الحاکم النیشاپوری، مترجم شاہ محمد چشتی، یو اینڈ می پریس لاہور ۲۰۰۹، ص ۲۴۰

(۲) سنن ابن ماجہ، ابو عبد اللہ محمد بن یزید قزوینی، دار الفکر، بیروت، دار السلام پبلی کیشنز لاہور، کتاب الفتن ص ۲۳۵

ہے؟اور ہم نے جن کو پہلے اہلِ کتاب بنایاوہ دل سے مانتے ہیں کہ یہ حق لے کر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ لہٰذا تم ہر گز شامل نہ ہوناشک کرنے والوں میں۔(۱۱۴)سچائی اور انصاف میں تمہارے رب کا کلام کامل ہے۔اس کی بات کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا وہ ہر بات سننے والا، ہر بات جاننے والا ہے۔(۱۱۵)اور اگر تم زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کے پیچھے چلوگے تووہ تمہیں گمراہ کر ڈالیں گے،وہ تو وہم وگمان کے سوا کسی چیز کے پیچھے نہیں چلتے،اور ان کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ خیالی اندازے لگاتے رہیں۔ (۱)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس کی تشریح میں فرمایا کہ:

دنیامیں بسنے والے اکثر لوگ قیاس و خیال کی تابعداری کرتے ہیں اسی کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اپنے عقائد، نظریات تشکیل دیتے ہیں قطع نظر اللہ کے بتلائے ہوئے رستے کے اسی کو اپنی راہ بناتے ہیں خیالات و تصورات کی زندگی سے جو ان کو میسر آتا ہے اسی کے مطابق اپنی زندگی گزارتے ہیں حالانکہ زندگی گزارنے کا وہی ایک طریقہ درست ہے جسے اللہ نے بتلایا ہے لہٰذا حق کے متلاشی کو چاہیئے کہ وہ اس بات کو مدِّ نظر رکھے کہ وہ جس راہ پر گامزن ہے وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر ﷺ کی بتلائی ہوئی ہے کہ نہیں اگر ہے تو اس پر دنیا کی پرواہ کئے بغیر ڈٹ جائے خواہ وہ اس رستے پر اکیلا ہی کیوں نہ رہ جائے۔ (۲)

مختصر یہ کہ اکثریت کی رائے ایک طرف ہو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اکثریت والے حق پر ہیں اس لیے رشد و ہدایت، یاضلالت و گمراہی کا فیصلہ اکثریت یا اقلیت کی بنیاد پر نہیں ہونا چاہیئے بلکہ دلائل کی بنیاد پر ہونا چاہیئے۔

اگر اس معیار کو سامنے رکھا جائے تو اکثریت کی بنیاد پر کسی بڑے طبقے کی جدوجہد درست ثابت نہیں ہو سکتی بلکہ طبقے کی یہ بات دیکھنی ہو گی کہ حق و صداقت کی بات کر رہے ہیں اور ان کے پاس اس حق کے دلائل بھی ہیں جو قرآن مجید اور سنتِ رسول اللہ ﷺ سے متضاد بھی نہیں ہیں تو اس بات کو ماننا دانش مندی ہے۔

اسی طرح مولانا امین اصلاحی لکھتے ہیں:

"اکثریت کی ظاہری شان و شوکت اس غلط فہمی کا شکار نہ کر دے کہ وہ حق پر ہیں کیوں کہ کثرت کا شور وغل اس بات کی دلیل نہیں ہے اس کا علم تو اللہ کو ہے کہ کون حق پر ہے اور کون سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ (۳)

---

(۱)سورۃ الانعام ۶/ ۱۱۲/ ۱۱۶

(۲) تفہیم القرآن، مولانا مودودی، ادارہ ترجمان القران لاہور، ۱۹۷۲ج، ص ۱ /۵۷۵

(۳)تدبر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحی، ادارہ فاران فاؤنڈیشن، ۱۴۰۳ھ، ج، ص ۳/ ۱۴۵

جمہوریت ملکی نظام چلانے کے لیے ہے نہ کہ حق و باطل کے فیصلوں کے لیے:

جمہوریت کو اسلام اور کفر کی جنگ نہ بنایا جائے کیوں کہ جمہوریت ایک نظام ہے جس سے ملک کا انتظام وانصرام چلانا مقصود ہے نہ حق و باطل کا فیصلہ کرانا مقصود ہوتا ہے یہ بات سوچی اور سمجھی جاتی ہے کہ لوگوں کو سہولیات کس طرح میسر ہوں اور لوگوں کو ان کے حقوق کس طرح سے حاصل ہوسکتے ہیں لازمی بات ہے اس میں اختلاف بھی ہوسکتا ہے اب اس اختلاف کا پر امن حل اکثریتی رائے سے ہی نکل سکتا ہے کہ اکثریت کی رائے اس طرف ہے اس پر فیصلہ کر دیا جائے۔ اگر آپ اکثریت رائے پر فیصلہ نہیں کریں گے اور لوگوں کو چھوڑ دیں گے کہ وہ خود فیصلہ کرلیں تو آپ نے خود لوگوں کو جنگ و جدال کی راہ دکھادی ان کے پاس سوائے جنگ کے اور کوئی راستہ نہیں بچتا۔ اس لیے سورۃ الانعام کی مذکورہ بالا آیت نمبر ۱۱۶ کا مضمون سورۃ الشوریٰ کی آیت نمبر ۳۸ کے مضمون سے متصادم ہو جائے گا اگر قرآن کی آیات کو اس کے سیاق وسباق سے ہٹائیں گے۔ اس لیے قرآن کریم کی آیات کا مفہوم سمجھنے کے لیے اس کے سیاق وسباق کو لازمی مدِ نظر رکھنا چاہیئے تاکہ دین میں نقصان سے بچا جاسکے۔ قرآن کی آیات کے ساتھ ساتھ احادیث نبوی کو بھی محل وقوع اور سیاق وسباق سے ہٹا کر نہیں پیش کرنا چاہیئے۔

اب اگر سورۃ الشوریٰ کی آیت نمبر ۳۸ کو دیکھا جائے تو یہ آیت جمہوریت کی وضاحت کے ساتھ تائید کرتی ہے اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ:

﴿ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ﴾[1]

ترجمہ: اور ان کے امور آپس کے مشورے سے ہوتے ہیں۔

علماء لکھتے ہیں کہ اسلامی جمہوریت پر امّت کی اکثریت متفق ہے۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ:

((إِنَّ اللَّهَ لَايَجْمَعُ أُمَّتِي أَوْقَالَ أُمَّةَ مُحَمَّدٍ ﷺ عَلٰى ضَلَالَةٍ))۔[2]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ جمع نہیں کرے گا میری امّت یا (راوی کہتے ہیں) آپ ﷺ نے فرمایا امّتِ محمد ﷺ کو گمراہی پر۔

اسی طرح آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ:

---

(۱) سورۃ الشوریٰ ۴۲/ ۳۸

(۲) جامع ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، ضیاء احسان پبلشرز، ۱۹۸۸، بَاب مَا جَاءَ فِي لُزُومِ الْجَمَاعَةِ، كِتَاب الْفِتَنِ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، حدیث نمبر: ۲۰۹۳

((فَمَا رَأَى الْمُسْلِمُونَ حَسَنًا فَهُوَعِنْدَ اللّٰهِ حَسَنٌ وَمَارَأَوْا سَيِّئًا فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ سَيِّئٌ))۔[1]

ترجمہ: جس چیز کے بارے مسلمان رائے دیں یہ اچھی ہے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہے اور جس کے بارے مسلمان رائے دیں کہ وہ بری ہے تو اللہ کے ہاں بھی وہ بری ہے۔

اسی کی تائید میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ:

((مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهِ))[2]

ترجمہ: جو کوئی جماعت سے ایک بالشت کے برابر جدا ہوا پس تحقیق اس نے اسلام کی رسی کو اپنی گردن سے نکال لیا۔

ایسے ہی ایک موقع پر فرمایا کہ:

((مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةِ مَاتَ مَيْتَةً جَاهِلِيَّةً))۔[3]

ترجمہ: جو کوئی جماعت سے جدا ہوا تو اس کی موت جاہلیت پر ہو گی۔

مذکورہ بالا تمام احادیث جمہوریت اور اس کے نظام کو ثابت کرتی ہیں احادیثِ مبارکہ میں ہے کہ امّتِ محمد ﷺ اجتماعی طور پر گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی۔

ووٹ شریعت کے نقطہ نگاہ میں:

ووٹ کی حیثیت کیا ہے یا شرعی اعتبار سے اس کا کیا مقام ہے اس حوالے سے مفتی اعظم پاکستان مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے ووٹ کی شرعی نقطہ نگاہ سے تشریح بیان کی ہے ان کا فرمانا ہے کہ ووٹ کو شریعت کی نگاہ میں کئی حیثیتیں دی جاسکتی ہیں شہادت، وکالت وغیرہ۔ قرآن کی روشنی میں اگر ووٹ کو شہادت کی حیثیت سے دیکھا جائے تو گواہی کو چھپانا ناجائز ہے۔ مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا فرمانا ہے کہ گواہی جھوٹی دینا بھی حرام ہے، اسی طرح گواہی پیسوں کی لالچ میں دینا بھی حرام ہے۔ اور جب اسے شہادت اور گواہی کا رتبہ اور مقام دیتے ہیں تو یہ پھر خالص اللہ کے ساتھ معاملہ ہو جاتا ہے اسے پھر دنیاوی معاملات کے طور پر لینا درست نہیں۔[4]

---

(۱) مسندِ احمد، امام احمد بن حنبل، ناشر مکتبہ رحمانیہ، لٹل سٹار پرنٹرز لاہور، ج، ص ۲/ ۶۴۸ حدیث نمبر ۳۶۰۰

(۲) مشکوٰۃ، ولی الدین الخطیب التبریزی، مترجم، محمد صادق خلیل، مکتبہ محمدیہ، چیچہ وطنی، ص ۳۱

أبو بكر عبد الرزاق بن همام بن نافع الحميري ، مصنف عبد الرزاق، كتاب الصلاة، باب الأمراء يؤخرون الصلاة، حبيب الرحمن الأعظمي الناشر بيروت الطبعه الثانيه، ۱۴۰۳ ج، حديث نمبر: ۹۳۷۷

(۴) مفتی محمد شفیع عثمانی، تفسیر معارف القرآن، ط اول، ۱۹۷۳، مکتبہ معارف القران کراچی، ج، ص ۳/ ۶۸

ان کا فرمانا ہے کہ آپ جس شخص کے حق میں ووٹ کاسٹ کرتے ہیں تو گویا آپ اس کے متعلق گواہی دے رہے ہوتے ہیں کہ یہ بندہ علم و عمل، عقیدہ، نظریہ، ایمان داری اور دیانت میں باقی تمام اشخاص سے بہتر ہے اور ان سب سے بڑھ کر اہلیت رکھتا ہے جو اس میدان میں اس کے مدِ مقابل ہیں۔ اگر اس بات کو دیکھا جائے تو کچھ حقائق سامنے آتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں

۱۔ ووٹر کی گواہی سے جو امیدوار کامیاب ہوا اور اسمبلی پہنچا یہ ممبرِ اسمبلی جتنے اچھائی کے کام کرے گا یا برائی کے کام کرے گا تو ان سب کاموں کے اجر و ثواب اور عذاب میں ووٹر بھی حصہ دار ہو گا۔

۲۔ یہ بات مدِ نظر رہنی چاہیئے کہ انفرادی معاملات میں کوئی کمی یا کوتاہی ہو تو اس کا اثر محدود رہتا ہے۔ لیکن اس سے پوری قوم متاثر ہوتی ہے اور بسا اوقات اس سے بہت بڑا نقصان ہو سکتا ہے اور پوری قوم تباہی کی طرف جا سکتی ہے جس کی وجہ سے اس کا ثواب اور اجر یا پھر عذاب بہت بڑا ہے

۳۔ قران مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ :

﴿ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ ﴾[1]

ترجمہ: اور مت چھپاؤ گواہی کو اور جو اس کو چھپائے گا گناہگار ہو گا۔

یعنی اگر لوگ امانت دار اور دیانت دار کو ووٹ نہیں دیں گے تو گناہ اور کوتاہی کے مرتکب ہوں گے۔

۴۔ اسی طرح جو شخص اسلامی نظریات کے خلاف نظریہ رکھتا ہے تو آپ نے اس کو ووٹ دیکر جھوٹی گواہی دی جو کہ گناہ ہے۔

۵۔ اپنا ووٹ دنیاوی لالچ یا رقم کے عوض دینا رشوت کے زمرے میں آتا ہے اور رشوت خور اور رشوت دینے والا دونوں جہنم کے مستحق ہیں۔ اور اس سے ملک و قوم کو جو نقصان ہو گا وہ تو ہو گا لیکن خود اس شخص نے دوسرے کے لیے اپنا دین ایمان تباہ کر دیا اس کو کون عقل مند کہے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص سب سے زیادہ نقصان میں ہے جو اوروں کی دنیا کی خاطر اپنا دین گنوا دے۔

دوسری آیت مبارکہ جسے جمہوریت کے خلاف بطورِ استدلال کے پیش کیا جاتا وہ سورۃ النساء کی مندرجہ ذیل آیت ہے۔

اللہ رب العزت کا فرمان ہے کہ:

---

(۱) سورۃ البقرۃ ۲/ ۲۸۳

﴿یٰاَیُّهَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾[1]

ترجمہ: اے مومنوں فرمانبرداری کرو اللہ اور اس کے پیغمبر ﷺ کی اوران کی جو تم میں سے اقتداروالے ہیں، پس اگر اختلاف ہو جائے کسی چیز کے بارے میں، پس لوٹاؤ اس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف۔

مذکورہ بالا آیتِ میں اللہ کی اطاعت اور اطاعت رسول ﷺ لازمی قرار دیا گیا ہے دین اسلام کی پیروی کرنے والا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی پیروی اپنے ایمان کا لازمی حصہ سمجھتا ہے۔اس لیے یہ بات ظاہر ہے کہ مسلمان ان کے علاوہ کسی اور کی پیروی کا سوچیں یا کسی کو اس پر آمادہ کریں جس طرح ایک مسلمان یہ نہیں کر سکتا اسی طرح مسلمان کیسے کسی کی بات مان سکتے ہیں کہ وہ کسی کے کہنے پر ان دو ہستیوں کو چھوڑ کر ان کی پیروی شروع کر دیں گے۔کیونکہ یہ مسلمانوں کے ایمان سے متصادم ہے۔جس سے یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے نظام حکمرانی پر خداوند تعالیٰ اور پیغمبر خدا ﷺ کے حکموں کی تابعداری لازمی امر ہے اسی طرح مسلمانوں کی مملکت کا کوئی ادارہ بھی اس بات متحمل نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ رب العزت اور رسول اللہ ﷺ کے احکامات پسِ پشت ڈال دیں یا اس کو نظر انداز کر کے اس کے خلاف قانون بنائے۔اور اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت و تابعداری کا حکم متعین وقت یا علاقے کیلیے نہیں بلکہ قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے ہے۔

اللہ کی طرف سے یہ حکم مسلمانوں کو جس وقت دیا گیا اس وقت رسول اللہ ﷺ پر وحی کا سلسلہ جاری تھا اسی لیے یہ حکم مسلمانوں کو دیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف اپنے اختلافات لائیں تا کہ نبی کریم ﷺ بذریعہ وحی اس اختلاف کو دور کر دیں۔بات واضح ہے کہ اللہ رب العزت کا حکم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے کوئی عارضی حکم نہیں ہے۔لہٰذا اب قیامت تک آنے والے صاحبِ اختیار ہوں، یا مسلمانوں کے پارلیمانی لوگ ہوں یا دوسرے ادارے ہوں سب پر لازم ہے کہ وہ اللہ رب العزت اور پیغمبر ﷺ کی پیروی و تابعداری کرتے ہوئے اپنے معاملات طے کریں اور اسی کے مطابق قانون سازی کریں۔اس کو چھوڑ کر خود سے کوئی فیصلہ کرنے یا قانون بنانے کا اختیار کسی کے پاس نہیں، اگر کوئی حکمران ایسا کرے گا تو شریعتِ اسلامی کی رو سے ایسے حکمران کی اطاعت لوگوں پر لازم نہیں حکمرانوں کے فیصلے جب ہی قابلِ اطاعت ہوں گے جب تک اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے احکامات کے تابع ہوں گے۔

---

(۱)سورۃ النساء:۴ / ۵۹

لہٰذا اس سے یہ استدلال کرنا کہ جمہوریت ضلالت ہے اور جمہوریت کا قرآن و سنت سے ٹکراؤ ہے قطعاً غلط ہے۔ کیونکہ جمہوریت کا تقاضا ہی قرآن کے بتلائے ہوئے اصول ﴿ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ﴾[1] اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر سب کا اتفاق سے فیصلہ نہ ہو سکے تو پھر اکثریتی رائے پر فیصلہ کر لیا جائے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ عوامی نمائندے اکثریت کی بنیاد پر جو مرضی فیصلہ کریں گے تو مسلمان اس کو حق مان لیں گے ایسا ہر گز نہیں ہے بلکہ صرف اتنا ہے کہ ہر شہری کا حق ہے جو اسے تفویض کیا گیا جس سے وہ دوسروں سے اختلاف کرے اور اپنے موقف کے حق میں لوگوں کو آمادہ کرے جس کے حق میں اکثریت فیصلہ دے دے تو تنازعہ کو ختم کرنے کے لیے اکثریت کی رائے کا تسلیم کر لینا ہے۔ یہ بات بھی مدّ نظر رہے کہ مسلمانوں کی پارلیمنٹ ہو یا کوئی اور ادارہ اگر وہ مسلمانوں کے ملک کا ادارہ ہے تو اس بات کا پابند ہے کہ اس کے تمام تر معاملات اور اختیارات "اطیعوا اللہَ واطیعوا الرسول" کے تابع رکھ کر ترتیب دینے ضروری ہیں۔

جمہوریت کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں کہ اگر عدالت کا سات رکنی بنچ کسی مقدمے میں اکثریتی رائے پر فیصلہ دیتی ہے تو اس فیصلے سے یہ بات تو نہیں اخذ کی جاتی کہ اس بنچ نے قانون کی بالادستی نہیں مانی۔ بلکہ یہی سمجھا جائے گا کہ اختلاف کے باوجود ایک ایسا طریقہ اختیار کیا جس سے وہ فیصلہ صادر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اب اسی عدالتی بنچ کی مثال کی روشنی میں مسلمانوں کی مملکت کے نظام کو دیکھا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب عوام الناس کی رائے کو کثرت کی وجہ سے ایک مقام ملتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا نعوذ باللہ عوام کی رائے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے بلند ہو گئی ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ عوام کی رائے پیشِ نظر رکھتے ہوئے متنازع اور مختلف فیہ مسائل کا حل کر کے لاگو کر دیا ہے۔ اور قرآن و سنت کی بالادستی اپنی جگہ قائم اور دائم رہے گی۔

﴿ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ﴾[2] اس آیت کا مطلب ہی یہی ہے کہ اپنے متنازع مسئلوں کو دور کرنے کے لیے اکثریت کی رائے کو حتمی مان لو اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں نکلتا کہ وہ رائے درست بھی مانی جائے۔ صرف اتنا ہے کہ وقتی اختلاف دور ہو گیا ہے۔ کوشش جاری رکھنی چاہیئے ہو سکتا ہے کہ رائے عامہ بدل جائے اور جب کبھی لوگوں میں احساس پیدا ہو جائے تو ان کو رائے بدلنے کا حق ہے۔ آئین میں بھی ان کی رائے سے ترامیم کروائی جا سکتی ہیں۔

سب کے لیے قانون یکساں نہیں:

جمہوریت کے متعلق یہ بات مشہور کی گئی ہے کہ جمہوریت میں قانون کا اطلاق سب پر یکساں نہیں ہوتا، طاقت ور کے لیے اور قانون اور کمزور کے واسطے الگ قانون ہوتا ہے، بلکہ بعض اوقات اشرافیہ طبقے کے لوگوں کو

---

(۱) سورۃ الشوریٰ ۴۲/ ۳۸

(۲) سورۃ الشوریٰ ۴۲/ ۳۸

استثنیٰ مل جاتا ہے جب کہ اس کی گنجائش اسلام میں نہیں۔ اسلامی تاریخ میں اس حوالے سے کئی مثالیں موجود ہیں سب سے بڑی مثال جنابِ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی اگر محمد ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے چوری کا ارتکاب ہوتا تو ان پر بھی حد جاری کی جاتی۔ اسی طرح تاریخِ اسلام میں وقت کے خلیفہ امیر المؤمنین سے بھرے مجمع میں ان کی رعیت کا عام فرد سوال کرتا ہے کہ آپ کے پاس یہ چادر کہاں سے آئی اور امیر المؤمنین اطمینان کے ساتھ سنتے ہیں اور اپنی صفائی پیش کرتے ہیں۔ جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اسلامی نظام میں کوئی استثنائی قانون ہے ہی نہیں، بلکہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ جب کہ جمہوریت کی نظر میں ایسا نہیں ہے۔

قاتل کی سزا کو معاف کرنا:

اسی طرح جمہوریت کے متعلق یہ بات بھی مشہور ہے کہ جمہوریت میں سربراہِ ریاست کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ سزایافتہ مجرموں کو بری کر دے اگرچہ وہ کسی کے قاتل ہی کیوں نہ ہوں لیکن اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں یہ حق صرف مقتولین کے ورثاء کو ہے۔

صداقت پر ہوتے ہوئے کامیاب نہیں ہو سکتا:

اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ جمہوری نظام میں فیصلے اکثریت کی رائے سے کیے جاتے ہیں۔ آج کل مادیت کا دور دورہ ہے اکثریت تو ادھر ہی جائے گی جس طرف، مال و دولت، طاقت اور برادری ہو گی۔ باجود پوری حقانیت اور سچائی کے چند لوگ کامیاب نہیں ہو سکتے کیوں کہ ان کے پاس اکثریت نہیں ہے۔

جواب:

مذکورہ بالا اعتراضات کا جواب آئینِ پاکستان میں موجود ہے اور مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے فتوے کو سامنے رکھا جائے تو یہ اعتراضات ختم ہو جاتے ہیں مثلاً آئینِ پاکستان کی رو سے ہر شخص پارلیمان کا رکن بن سکتا ہے جو شق نمبر ۶۲ اور ۶۳ پر پورا اترتا ہو جس میں صحیح طور پر لکھا ہوا ہے کہ وہ شخص صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو اس کی شہرت نیک اور صالح شخص کے طور پر ہو اور صادق اور امین ہو اگر اس پر عملدرآمد کیا جائے تو ہماری پارلیمنٹ بہت سے برے لوگوں سے صاف ہو سکتی ہے لیکن یہ عمل کرے کون؟ اس کے لیے ایک مستقل ادارہ ہونا چاہیئے الیکشن کمیشن سے ہٹ کر جس طرح ایران نے ولایت فقہ کا ادارہ قائم کیا جو امیدوار کی چھان بین کا ادارہ ہے کہ امیدوار اہل ہے کہ وہ رکنِ پارلیمنٹ بنے پہلے سے ہی اس کی تحقیقات ہونی چاہئیں۔ تاکہ عوام اچھے لوگوں کو اپنا نمائندہ نامزد کر سکیں۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے فتوے کے مندرجات:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فتوے میں ووٹ کی حیثیتیں بیان کیں۔

۱۔ پہلی یہ ہے کہ ووٹر سفارش کر رہا ہے۔

۲۔ دوسری حیثیت یہ ہے کہ ووٹر گواہی (شہادت) دے رہا ہے۔

۳۔ تیسری حیثیت وکالت کی ہے۔

یہ تین حیثیتیں سامنے رکھی جائیں اور اس پر عوام کی ذہن سازی کی جائے کہ آپ جو ووٹ دینے جا رہے ہو اس میں یہ ذہن نشین ہو کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ شخص باقیوں کی بنسبت قابل، ایمان دار وغیرہ وغیرہ ہر لحاظ سے بہتر ہے اسلیے اس کو ہمارا نمائندہ ہونا چاہیئے۔ یا اس کی سفارش کر رہے ہو کہ میری نظر میں اس سے بہتر کوئی نہیں لہٰذا میری سفارش ہے کہ اس کو ہمارا نمائندہ بنایا جائے۔ یا آپ کی نظر میں وہ آپ کے حقوق کی جنگ باقیوں کی بنسبت بہتر لڑ سکتا ہے یا آپ کو بہتر حقوق دلا سکتا ہے اس لیے آپ کہتے ہیں کہ اسے میں باقیوں کی بنسبت اپنا وکیل منتخب کرتا ہوں۔ عوام کو یہ بتایا جائے کہ ان ساری حیثیتوں میں قابل، نیک اور صالح شخص کو ووٹ دینا ثواب کا باعث ہے جو انشاء اللہ اس کو ملے گا۔ لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہوا تو نتیجہ بھی اس کے الٹ ہو جائے گا اور بجائے ثواب کے عذاب کا حقدار ٹھہرے گا (بوجہ جھوٹی گواہی کے یا بری سفارش کے یا ناجائز وکالت کے)

جمہوری اصولوں کو مقید کرنا:

پاکستان چونکہ ایک اسلامی جمہوریہ ہے لہٰذا اس کی جمہوریت کا مغرب کی جمہوریت سے تقابل نہیں کیا جا سکتا پاکستان کا دستور اس بات کو کچھ قیود کے ساتھ مقید کرتا ہے آئینِ پاکستان کے شروع میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ:

۱۔ اللہ ربّ العزت کی ذاتِ مقدس پوری کائنات کی حاکمِ مطلق ہے اور پاکستان کی عوام کو جو اختیار واقتدار ملا ہے وہ اسے اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کر سکتے ہیں، ان کے پاس اقتدار و اختیار ایک مقدس امانت ہے۔[1]

۲۔ ایسا نظام قائم کیا جائے جو عوام کی خواہش کے مطابق ہو جس میں جمہوریت، آزادی، انصاف، مساوات کے اصولوں پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عمل کیا جائے۔

۳۔ ایسے ہی آئینِ پاکستان کے عمرانی عدل کے متعلق یہ الفاظ بیان کئے گئے ہیں: کہ پاکستان میں عمرانی عدل اسلامی اصولوں پر قائم ہو گا اور یہ ملک ایک جمہوری ملک ہو گا۔ آئینِ پاکستان کے آرٹیکل ۲ میں درج ہے کہ اسلام ریاستِ پاکستان کا مملکتی مذہب ہو گا اور آرٹیکل ۲ اے میں آئینِ پاکستان کا مستقل حصہ قرار دادِ مقاصد کو بنا دیا گیا ہے۔[2]

---

(۱) آئینِ پاکستان، آرٹیکل ۲/ ص:۳

(۲) ایضاً

۴۔ پاکستان کا آئین حکومت کو اس بات کا پابند کرتا ہے کہ لوگوں کو ایسی سہولتیں مہیا کرے جو لوگوں کو قرآن مجید اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کے مفہوم کو سمجھنے میں مدد دے سکیں بلکہ مملکت اس بات کی ذمہ دار ہے کہ ایسے اقدامات اٹھائے جن سے مسلمانانِ پاکستان اسلامی اصولوں کے تحت اپنی زندگی گزار سکیں۔ (۱)

۵۔ آئینِ پاکستان میں مغربی جمہوریت کی بنیاد کو مسترد کیا گیا ہے جس کے مطابق اصل حاکمیت عوام کی ہے پاکستان کا آئین اس بات کو اس طرح رد کرتا ہے کہ تمام موجودہ قوانین کو قرآن وسنت کی تعلیمات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے منضبط کیا جائے یعنی اسلامی احکامات کے مطابق تشکیل دیا جائے اور ایسا قانون نہ بنایا جائے جو اسلامی تعلیمات سے متصادم ہو۔ (۲)

۶۔ قرآن وسنت کے لیے آئینِ پاکستان میں اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل کے مقاصد اور اس ادارے کے فرائض وضاحت کے ساتھ موجود ہیں مثلاً قانون کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھنا کہ یہ اسلامی ہے یا اسلام سے متصادم یا اس کے متعلق اپنی سفارشات دینا کہ اسے کس طرح اسلامی بنایا جاسکتا ہے۔ (۳)

لہٰذا مذکورہ بالا بحث میں جمہوریت کے متعلق اعتراضات اور ان کے جوابات کو دلائل کے ساتھ بیان کرنے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جمہوریت پر بے جا اعتراضات کرکے اس نظام کو متنازعہ بنایا گیا ہے حقیقت میں جمہوری نظام اسلام سے متصادم نہیں ہے۔

بس دعا یہ ہے کہ اللہ صحیح معنوں میں اس ملک میں اسلامی جمہوریت کا نفاذ کردے آمین۔

---

(۱) ایضاً، آرٹیکل ۳۱/ص:۱۷

(۲) ایضاً، آرٹیکل ۲۲۷/ص:۱۴۵

(۳) ایضا

نتائج مقالہ

اس مقالہ پر کام کے دوران متعدد باتیں سامنے آئیں

ا

ا۔ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد مدینہ کی اسلامی ریاست جس کے حکمران نبی کریم ﷺ خود تھے، ان کے بعد خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسلامی ریاست کے سربراہ رہے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد حضرات تابعین نے حکمرانی کی ان سب نے اپنی ریاستوں کو حقیقی معنوں میں فلاحی ریاستیں بنایا۔

۲۔ اسلامی نظامِ حکومت کا مقصد ہے کہ فلاحی ریاست قائم ہو اور حقیقی فلاحی ریاست کے قیام کے لیے اسلامی نظام حکومت میں مکمل راہنمائی موجود ہے۔

۳۔ حقیقی فلاحی ریاست میں مناصب اور عہدے قابلیت واہلیت کی بنیاد پر دیئے جاتے ہیں۔ جیسے عہد نبوی، عہد خلفائے راشدین اور بعد کی اسلامی ریاستوں میں عہدے اور منصب دیئے جاتے رہے۔

۴۔ نااہل لوگوں کو مناصب اور عہدے سونپنے سے ادارے اور ملک تباہی کی جانب گامزن ہوتے ہیں۔ جس طرح بنوامیہ کا دور حکومت نااہل حکمرانوں کی وجہ سے ختم ہوا۔

۵۔ حکمرانوں کے انتخاب کے لیے عوام کی تربیت کی ضرورت ہے عوام کو شعور دینے کی ضرورت ہے، تعلیم اس کا اہم ذریعہ ہے۔

۶۔ مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ ان تین اداروں کو ریاست کا ستون کہا جاتا ہے۔ اسلامی نظامِ حکومت میں ان اداروں کو اور ان اداروں کے سربراہوں کو خاص مقام حاصل ہے اس لیے ان اداروں کو جن خطوط پر استوار کرنا ہے وہ خطوط اور ان کے سربراہوں کو جن صفات کا حامل ہونا چاہیئے وہ صفات سب بیان کی ہیں۔

۷۔ مسلم حکمرانوں نے فلاحی ریاست کو اس کی معراج تک پہنچایا وہ وہ اصلاحات کیں جن اصلاحات کی آج کی جدید دنیا بھی معترف ہے۔ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اصلاحات جو یورپ، بریطانیہ کے تہذیب یافتہ قوموں کے ہاں اب بھی رائج ہیں۔

۸۔ اسلام نے حکمرانوں کے اوصاف و شرائط بیان کئے ہیں جن اوصاف و شرائط سے اس دور میں بھی حقیقی معنوں میں فلاحی ریاستیں قائم ہو سکتی ہیں۔

۹۔ پاکستان کو فلاحی ریاست بنانے کے لیے اہم فیصلوں کی ضرورت ہے مثلاً آئین پاکستان پر کماحقہ عملدرآمد کیا جائے تو یہ آئین ملک کو صحیح معنوں میں فلاحی ریاست کی بنیاد فراہم کر سکتا ہے۔

۱۰۔ اسلامی فلاحی ریاست اپنے مسلمان باشندوں کے حقوق کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کے حقوق کی بھی ضامن ہوتی ہے۔

۱۱۔ اسلامی ریاست اپنے پڑوس کے ساتھ اچھے تعلقات کی خواہاں ہوتی ہے اگرچہ وہ پڑوسی غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں مثلاً آپ ﷺ کا یہودیوں کے ساتھ معاہدہ کرنا امن کی خاطر یا اپنی ریاست مدینہ کے تحفظ کی خاطر آپ ﷺ نے یہودیوں سے معاہدہ کیا تھا۔

۱۲۔ پاکستان اسلامیہ جمہوریہ ہے آئین پاکستان کی رو سے اس ملک میں اسلام کا نفاذ عملی طور پر ہونا لازم ہے۔

۱۳۔ جمہوریت کے بارے میں غلط مشہور کیا گیا ہے کہ جمہوریت اسلام کے نفاذ کو روکتی ہے۔ بلکہ کچھ مذہبی اور سیاسی جماعتیں ہیں جو اپنے منشور اور دستور سے انحراف کرتے ہوئے وقتی مصلحتوں اور ذاتی و سیاسی مفادات کی خاطر اسلام کے نفاذ میں صحیح معنوں میں مخلص نہیں اور سچے دل کے ساتھ اس کے نفاذ کی اس طرح کی جدوجہد نہ کر سکے جس کے سبب ابھی تک یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

حاصلِ کلام

حاصل کلام یہ ہے کہ پاکستان اسلامیہ جمہوریہ ہے جو ایک نازک ترین دور سے گزر رہا ہے ایک طرف تو اغیار کی سازشیں ہیں جو ہماری نوجوان نسل کو تباہ کر رہی ہیں تو دوسری طرف مسلکی، لسانی تعصب اور فرقہ پرستی، بد امنی، کرپشن، جہالت کا وہ طوفان ہے جس نے ہمیں بری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے آج اگر ہم اپنی اور اپنی آنے والی نسلوں کی بقا چاہتے ہیں اور اپنی زندگیوں کو امن و سکون کا گہوارہ بنانا چاہتے ہیں تو اس کا واحد راستہ پاکستان کو حقیقی معنوں میں اسلامیہ جمہوریہ پاکستان بنانے میں ہے۔ جو اس اسلامی ریاست کو ایک فلاحی ریاست بنانے کا واحد راستہ ہے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ آئینِ پاکستان میں شامل قراردادِ مقاصد کو مدّ نظر رکھ کر ملک کا نظم و نسق چلایا جائے جو کہ اسلامی جمہوری نظام کے نفاذ کا ذریعہ ہے اور یہی وہ شاہراہ ہے جو امن و آتشی کی ضامن ہے۔ جس کی مثال زمانہ جہالیت میں اسلام پیش کر چکا ہے کہ تاریکی کے اس دور میں جب قانون نام کی کوئی چیز نہ تھی ایک فارمولا تھا کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس جس کے پاس طاقت تھی وہ جو چاہے کر لے دولت مند اور طاقتور قتل بھی کر لیتے تو ان کو کوئی پوچھ نہیں سکتا تھا ان مخدوش حالات میں اسلام کا ڈھنکا بجتا ہے اور لوگ اسلام قبول کرتے ہیں، اسلام لانے کے بعد جو دستہ و گریبان تھے وہ بغلگیر ہو گئے، جو ایک دوسرے کو دیکھنا تک نہیں چاہتے تھے آپس میں شیر و شکر ہو گئے۔ آج بھی اگر اسلامی نظام کی طرف کما حقہ توجہ کر لی جائے تو انشاء اللہ یہ ملک بہت جلد صحیح معنوں میں پر امن اور ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے گا۔

موجودہ حالات میں ایک مرتبہ پھر اسی حکمت عملی کو اپنانے کی ضرورت ہے جائے جو حکمتِ عملی قرون اولیٰ میں اپنائی گئی تھی۔ اس سلسلے میں بات صرف اتنی سی ہے کہ ہمیں مسلکی تعصب، لسانی تعصب، فرقہ واریت، عناد اور باہمی بغض کے بتوں کو پاش پاش کرنا ہو گا دین اسلام کو شدت پسندی کا محور بنانے والوں کا احتساب کرنا ہو گا افراط و تفریط کا راستہ چھوڑ کر اعتدال کا راستہ اختیار کرنا ہو گا اور امت مسلمہ کو درپیش مسائل کا ادراک کرتے ہوئے اپنی دینی اور ملی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ہو گا اور خود کو بہترین امت ثابت کرتے ہوئے تمام باشندگانِ پاکستان کو دین اسلام کے پرچم تلے اکھٹا کرنا ہو گا۔ (اللہ پاک ہمیں عمل کی توفیق نصیب فرمائے) آمین

سفارشاتِ مقالہ

۱۔ پاکستان اسلام کے نام پر بننے والی ریاست ہے۔ اس ریاست کے بنیادی ادارے مقننہ، عدلیہ، اور انتظامیہ ہے یہ ادارے اس طرح تشکیل دیئے جائیں جیسے قرونِ اولیٰ میں اسلامی ریاست کے ادارے تشکیل دیئے گئے تھے جن کی کچھ تفصیل مقالہ ہٰذا میں درج ہے۔ پھر ان اداروں کے سربراہان منتخب کرنے کے لیے ان صفات کا خیال رکھا جائے جو ان اداروں کے سربراہان کے لیے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اہل علم نے بیان کی ہیں۔

۲۔ پاکستان میں اسلامی جمہوری نظام کو بہتر بنانے کے لیے اس کے اداروں کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ اور ادارہ بہتر اسی وقت ہو گا جب اس ادارے کا سربراہ بہتر ہو گا۔ یہ اسی صورت ہو گا جب تمام اداروں کے مناصب اور عہدے قابلیت کی بنیاد پر دیئے جائیں نہ کہ اقربا پروری، قوم قبیلہ، جتھہ، تعلق، دولت، طاقت، اور نہ ہی کسی اور طمع یا غرض کی بنیاد پر دیئے جائیں۔ یہ بات تو طے ہے کہ جس ادارے کا سربراہ جتنا قابل ہو گا وہ ادارہ اتنا زیادہ احسن طریقہ سے اپنی کارکردگی دیکھائے گا۔

۳۔ ان اداروں میں عدلیہ کا ادارہ ہے پاکستان میں عدلیہ کے سربراہ کا تعین مخصوص طریقہ کار کے تحت عمل میں لایا جاتا ہے۔ جب کہ سفارش یہ کی جاتی ہے کہ اس میں اسلامی تعلیمات میں جو شرائط قاضی القضاء کے لیے لازمی قرار دی گئی ہیں ان شرائط کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عدلیہ کا سربراہ متعین کیا جائے۔ جس سے بہتر فرد اس منصب پر فائز ہو سکے اس لیے موجودہ عدلیہ کے رائج طریقہ کار میں نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

۴۔ ۔ مقننہ کا مطلب مجلس شوریٰ یعنی پارلیمنٹ اب پارلیمنٹ کا رکن پاکستان میں عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوتا ہے سفارش یہ کی جاتی ہے ووٹوں کا مرحلہ بعد میں آتا ہے پہلے اس نمائندے کی جانچ پڑتال کی جانی ضروری ہے۔ مثلاً اس کی قابلیت کیا ہے اس کے لیے باقاعدہ تعلیمی قابلیت کا تعین کیا جانا چاہیئے وہ تعلیمی قابلیت اسلامی تعلیمات کو مدِ نظر رکھ کر متعین کرنی چاہیئے۔

۵۔ انتظامیہ کا سربراہ حاکم کہلاتا ہے حاکم یا حکمران جسے عوام اپنے ووٹوں سے منتخب کرتی ہے یا عوام کے ووٹوں سے منتخب شدہ اراکین جس کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس بارے میں سفارش یہ کی جاتی ہے کہ اس کے لیے ضروری ہونا چاہیئے کہ وہ عوام سے ووٹ لینے کے ساتھ ان صفات کا حامل بھی ہو جو اسلام نے مسلمانوں کے سربراہِ مملکت کے لیے لازمی قرار دی ہیں۔

۶۔ ہمارے ملک پاکستان میں آئینِ پاکستان اس بات کو لازم قرار دیتا ہے کہ تمام قوانین قرآن و سنت کے مطابق ہوں گے قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنے گا سفارش یہ کی جاتی ہے کہ قومی اسمبلی، صوبائی

اسمبلیوں اور سینٹ کے امیدواروں کی اہلیت کی شرائط میں قرآن وسنت کے بنیادی علوم کا علم اور حلال و حرام میں فرق کر سکنے جتنے علم کی شرط ہونی چاہیئے۔

۷۔ سفارش کی جاتی ہے کہ تمام اداروں کو آپس میں مربوط کیا جائے جو کہ بظاہر ایک دوسرے کے ساتھ رابطے میں ہیں لیکن تماماداروں کو ایک صف (پیج) میں لایا جائے، جس سے اداروں کی کارکردگی میں بہتری آئے گی۔

۸۔ سفارش کی جاتی ہے کہ جمہوریت کو اگر کچھ عرصہ تک بلاروک ٹوک کام کرنے دیا جائے تو انتخابات کا عمل برے سیاستدانوں کو خود بخود جمہوری عمل سے باہر کر دے گا۔ عوام میں اتنا شعور آچکا ہے کہ کون برا ہے اور اچھا ، کس کی کارکردگی اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ موقع دیا جائے اور کس کی کارکردگی اس قابل ہے کہ اس کو گھر بھیج دیا جائے۔ لیکن یہ اسی صورت ممکن ہے جب عوام کو بار بار اس عمل سے گزارا جائے۔ جس سے ان کی تربیت کے ساتھ ملکی نظام بھی بہتری کی جانب گامزن ہو گا ۔اس سلسلے میں عوام کی اصلاح کے پروگرامات کرانا بھی مفید ہے اور میڈیا کے ذریعے اس شعور کو اجاگر کرنا بھی مفید ہے

فہرست آیات

نمبر شمار	آیات	سورۃ/ آیات نمبر	صفحہ نمبر
۱.	﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ ---﴾	البقرۃ:۲/۳۰-۳۳	۱۰
۲.	﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ ادْخُلُواْ فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ----﴾	البقرۃ:۲/۲۰۸	۴
۳.	﴿وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ --﴾	البقرہ:۲/۲۱۳	۳۵
۴.	﴿قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ﴾	آل عمران:۳/۲۶	۳۵
۵.	﴿كُنتُم خَيرَ اُ مَّة أُخرِجَت لِلنَّاسِ﴾	آل عمران:۳/۱۱۰	۵۱
۶.	﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾	آل عمران:۳/۱۵۹	۳۸،۱۰۳،۱۳
۷.	﴿وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾	آل عمران:۳/۱۸۹	۳۵
۸.	﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ---﴾	النساء:۴/۵۹	۳۱
۹.	﴿وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ ---﴾	المائدۃ:۵/۳	۱۸
۱۰.	﴿إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا﴾	المائدۃ:۵/۲۰	۸
۱۱.	﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَا---﴾	المائدۃ:۵/۴۴	۳۶
۱۲.	﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ ----﴾	المائدۃ:۵/۴۵	۳۶
۱۳.	﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ ----﴾	المائدۃ۵/۴۷	۳۶
۱۴.	﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ﴾	الانعام:۶/۵۷	۳۴،۱۲
۱۵.	﴿أَلَا لَهُ الْحُكْمُ﴾	الانعام:۶/۶۲	۳۵
۱۶.	﴿ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ---﴾	الانعام:۶/۱۰۲	۲۹
۱۷.	﴿أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُم --﴾	الانعام:۶/۱۱۴	۳۵
۱۸.	﴿أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ﴾	الاعراف:۷/۵۴	۱۰۰،۳۵
۱۹.	﴿ وَإِن جَنَحُواْ لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى ----﴾	الانفال:۸/۶۱	۳
۲۰.	﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً﴾	التوبۃ:۹/۱۰۳	۴۰
۲۱.	﴿وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا ----﴾	یونس:۱۰/۱۳	۱۳
۲۲.	﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا ----﴾	النحل:۱۶/۹۱	۳۶

۲۳.	﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾	لاسراء:۱۷/۳۴	۳۷
۲۴.	﴿وَقُلْ رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي ----﴾	الاسراء:۱۷/۸۰	۲۰،۶
۲۵.	﴿الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ ----﴾	الحج:۲۲/۴۱	۸۲،۲۱
۲۶.	﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَات---﴾	النور:۲۴/۵۵	۸
۲۷.	﴿يَادَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ ---﴾	ص:۳۸/۲۳	۱۰۱
۲۸.	﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾	الشوری:۴۲/۳۸	۷۹،۳۸،۱۳
۲۹.	﴿وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾	الذاریات:۵۱/۱۹	۴۰
۳۰.	﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾	الذاریات:۵۱/۵۶	۱۲
۳۱.	﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ ----﴾	الحدید:۵۷/۲۵	۸۱

فہرست احادیث

نمبر شمار	احادیث	کتب احادیث	صفحہ نمبر
۱.	الا ان رحاالاسلام دائرةفدوروامع الكتاب--	معجم کبیر	۵۲
۲.	إِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ وَإِذَا ------	صحیح بخاری	۱۰۴
۳.	الْإِسْلَامُ وَالسُّلْطَانُ أَخَوَانِ تَوْأَمٌ، -----	فضیلۃ العادلین	۷
۴.	إن الله جعل السلام تحية لأمتنا وأمانا ----	معجم کبیر	۳۷
۵.	تُبَايِعُونِي عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ -----	مسند احمد	۲۲
۶.	تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِم	صحیح بخاری	۴۰
۷.	خِيَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِينَ تُحِبُّونَهُمْ وَيُحِبُّونَك ----	صحیح مسلم	۱۰۵
۸.	رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ، أَنَا شَهِيدٌ أَنَّ الْعِبَادَ ---	مسند احمد	۸۱
۹.	لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ، وَلَا ------	مسند احمد	۸۲
۱۰.	مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ وَمَنْ عَصَانِي----	صحیح بخاری	۳۱
۱۱.	وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ إِنْ عَلَى -------	صحیح مسلم	۴۰

فہرست اعلام

نمبر شمار	اعلام	صفحہ نمبر
۱.	راغب اصفہانی	۱۰۲
۲.	شاہ ولی اللہ	۵،۸،۶۶
۳.	علامہ اقبال	۵۱
۴.	غزالی	۱۰،۱۰۱
۵.	محمد شفیع	۱۷۱
۶.	محمود احمد غازی	۳۰

فہرست مصادر و مراجع

- ابن جریر طبری تاریخ طبری، (مترجم، سید محمد ابراہیم ایم۔اے ندوی): دارالاشاعت کراچی، ۲۰۰۳ء
- ابن عطیہ الاندلسی، المحرر الوجیز فی تفسیر کتاب العزیز (تفسیر ابن عطیہ)،
- ابن ہشام، (سیرۃ النبی، مترجم مولوی قطب الدین احمد صاحب محمودی)، اسلامی کتب خانہ، اردو بازار لاہور
- ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر قرشی بصری ثم الدمشقي، تفسیر القرآن العظیم، دار طیبۃ للنشر والتوزیع، ط، ثانی، ۱۴۲۰ھ
- أبو القاسم الحسین بن محمد المعروف بالراغب الأصفهانی، مفردات فی غریب القرآن، دار القلم، الدار الشامیۃ، دمشق بیروت، ط، اولیٰ، ۱۴۱۲ھ۔
- ابو جعفر محمد بن جریر طبری، تاریخ طبری، دار الکتب العلمیہ بیروت، لبنان ۱۴۰۷ھ،
- ابو حاتم محمد بن حبان، صحیح ابن حبان، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۳ء
- ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، دار طوق النجاۃ، ط، اولیٰ، ۱۴۲۲ھ
- أبو نعیم أحمد بن عبد اللہ بن أحمد بن إسحاق بن موسی بن مهران الأصبهاني، فضیلۃ العادلین من الولاۃ لأبی نعیم، دار الوطن، الریاض، ط، اولی، ۱۴۱۸ھ۔
- ابو نعیم عبد الحکیم خان نشتر جالندھری، قائد اللغات، حامد اینڈ کمپنی، ناشران و تاجران اسلامی کتب، مدینہ منزل ۳۸، اردو بازار لاہور
- ابو حامد امام غزالی البر المسبوک فی نصائح الملوک، (س،ن)
- ابو عبد اللہ محمد بن یزید قزوینی، سنن ابن ماجہ، دار الفکر، بیروت
- ابی الحسن علی بن محمد حبیب الماوردی، الاحکام السلطانیہ والولایات الدینیۃ، ط، اولیٰ، ۱۴۰۹ھ، مکتبہ دار ابن قتیبہ، کویت
- امام شاطبی موافقات فی اصول الشریعۃ،، (س،ن)
- امیر علی، مختصر تاریخ اسلام (اُردو ترجمہ) ایڈیشن ۱۹۵۱ء
- الحاج مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات اردو جامع، فیروز سنز، ۱۸۹۴ء، لاہور، راولپنڈی
- حمید اللہ، اسلام کا تعارف، بیروت لبنان، دار الارشاد
- ڈاکٹر الحکیم، فکرِ اقبال، اقبال اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۲ء،
- ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، بال جبریل، مطبع اقبال اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲ء

- ڈاکٹر محمد اقبال، نظم "فرمانِ خدا"، بحوالہ، اقبال کا "سلطان جمہور" کا دور کب آئے گا، پروفیسر فتح محمد ملک، ۹نومبر ۲۰۱۴، شمارہ، تجزیات، لاہور
- ڈاکٹر محمد اقبال علامہ، کلیات اقبال، اقبال اکادمی لاہور، ۲۰۰۰ء
- ڈاکٹر محمود احمد غازی، محاضراتِ شریعت، الفیصل ناشران و تاجران کتب، اردو بازار لاہور، ط، اول، ۲۰۰۹ء
- سلیمان بن أحمد بن أيوب أبو القاسم الطبراني، معجم کبیر للطبرانی، ط، ثانی، ۱۴۰۴ھ
- سلیمان بن موسیٰ اندلسی، الاکتفاء فی مغازی رسول اللہ والثلاثۃ خلفاء، کلاعی، مکتبہ الھلال بیروت، لبنان ۱۳۸۶ھ
- سید ابو الاعلیٰ مودودی، خلافت و ملوکیت، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۹۲ء
- سید نذیر نیازی، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، بزم اقبال لاہور
- شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ازالۃ الخفاء، فصل اول، مقصد اول، قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی
- شبیر احمد انصاری، تاریخ الخلفاء، اردو ترجمہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ ۱۹۸۳ء
- شرف الدين الحسين بن عبد الله الطيبي، شرح الطيبي على مشكاة المصابيح المسمى ب-(الكاشف عن حقائق السنن) ، مكتبة نزار مصطفى الباز (مكة المكرمة - الرياض)، الأولى، ۱۴۱۷ ه- - ۱۹۹۷ م، كتاب الإمارة والقضاء، حديث نمبر، ۳۶۹۶ص: ۸/ ۲۵۷۶
- عبد المحسن بن حمد بن عبد المحسن بن عبد الله بن حمد العباد البدر، شرح سنن ابی داؤد، مکتبہ شاملہ، (س،ن)
- علامہ اقبال، ارمغانِ حجاز، نظم " ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" ، مطبوعہ نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۷۸،
- علامہ شبلی نعمانی، الفاروق، ص: ۱۸۴
- علامہ محمد اقبال، ضربِ کلیم، رباعی، "جمہوریت"، ص: ۱۱، زمزم پبلشرز، کراچی، ۱۹۸۱ "یہ نظم ۲۲ اگست ۱۹۳۵ کو بھوپال (شیش محل) میں لکھی گئی"۔
- عماد الدین، حافظ ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، ابو الفداء دار الکتب العلمیۃ بیروت، ۱۴۱۹ھ
- قطب الدین شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، بیروت لبنان
- کنز العمال، علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین الہندی، مکتبۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۵ء
- محمد بن مکرم بن منظور افریقی مصری، لسان العرب، دار صادر- بیروت (س،ن)
- محمد بن یوسف بن علي بن سعید، تحقیق الفوائد الغیاثیۃ، شمس الدین الکرمانی، مکتبۃ العلوم والحکم، المدینۃ المنورۃ -المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، طبعہ، اولیٰ، ۱۴۲۴ھ

- مسند احمد، أبو عبد الله أحمد بن محمد بن حنبل بن هلال بن أسد الشيباني، موسسۃ الرسالۃ، ط، اولیٰ، ۱۴۲۱ھ
- مسند احمد، امام احمد بن حنبل، مؤسسۃ الرسالہ، ۲۰۰۱ء
- وارث سرہندی ایم۔اے، علمی اردو لغت، علمی کتاب خانہ، کبیر سٹریٹ اردو بازار لاہور
- وارث سرہندی، قاموس مترادفات، اردو سائنس بورڈ، ۲۹۹ اپر مال، لاہور
- وجاہت مسعود، جمہوریت کیا ہے، ناشر، بلیو ویز، اسلامیہ کلب بلڈنگ خیبر بازار، پشاور، ۱۲ نومبر ۲۰۱۶ کو ملتان میں لاہور ہائیکورٹ کی ڈیڑھ سو سالہ تقریبات کے سلسلہ میں منعقدہ کانفرنس میں پڑھا جانے والا مضمون: بعنوان، جمہوریت کیا ہے؟
- Joseph, Shipley T. Dictionary of word origins , philosophical Lib, New York 1945
- William Little H.W Fowler J. Coulson, the shorter Oxford English Dictionary . The Caledon press London ,1965
- Blotchily, Johann Caspar, The Theory of the State, 2000